

یارانِ کہن

عبدالمجید سالک

جملہ حقوق محفوظ
بحق مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY ★ MAILSI ★
ACC No: 64826

مسعود جھنڈیر
میلسی (پاکستان)
نمبر شمار ....
کتاب نمبر ....

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

اشاعتِ ثانی

ایک ہزار

بار اول : ——— دسمبر ۱۹۵۵ء

بار دوم : ——— جولائی ۱۹۶۷ء

قیمت : ——— چار روپے

طابع : ——— چٹان پرنٹنگ پریس لاہور

گزارش

اگر اس کتاب کے ہر مضمون میں آپ کو سالک
نظر آئے تو اِس پر بد کنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تذکرہ ہی صِرف
اُن بزرگوں کا ہے، جن سے سالک کے براہ راست روابط قائم
ہوئے۔ لہٰذا اس میں جا بجا "صیغۂ واحد متکلم" کا استعمال ناگزیر تھا۔
اس تذکرے سے اُن بزرگوں کے سوانحِ حیات
لکھنا یا اُن کی تصانیف پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں، صرف اُن کی
شخصیتوں کی ہلکی سی جھلک دکھانا منظور ہے۔ اور مَیں سمجھتا

ہوں کہ میں اس مقصد میں ناکام نہیں رہا۔

یہ کتاب آغا شورش کے "تواتی ڈالنے" کی وجہ سے صرف چند روز میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے اگر اس میں کوئی ایسے اسقام نظر آئیں جو اہلِ ذوق کے نزدیک میرے اسلوبِ تحریر کے شایاں نہ ہوں تو اُن کی ذمہ داری اُسی "بلائے بے درماں" کے سر ہے، جس کو شورش کہتے ہیں اور جس کی کسی ضد سے میں سرتابی نہیں کر سکتا۔

مسلم ٹاؤن لاہور، یکم دسمبر ۱۹۵۵ء

عبدالمجید سالک



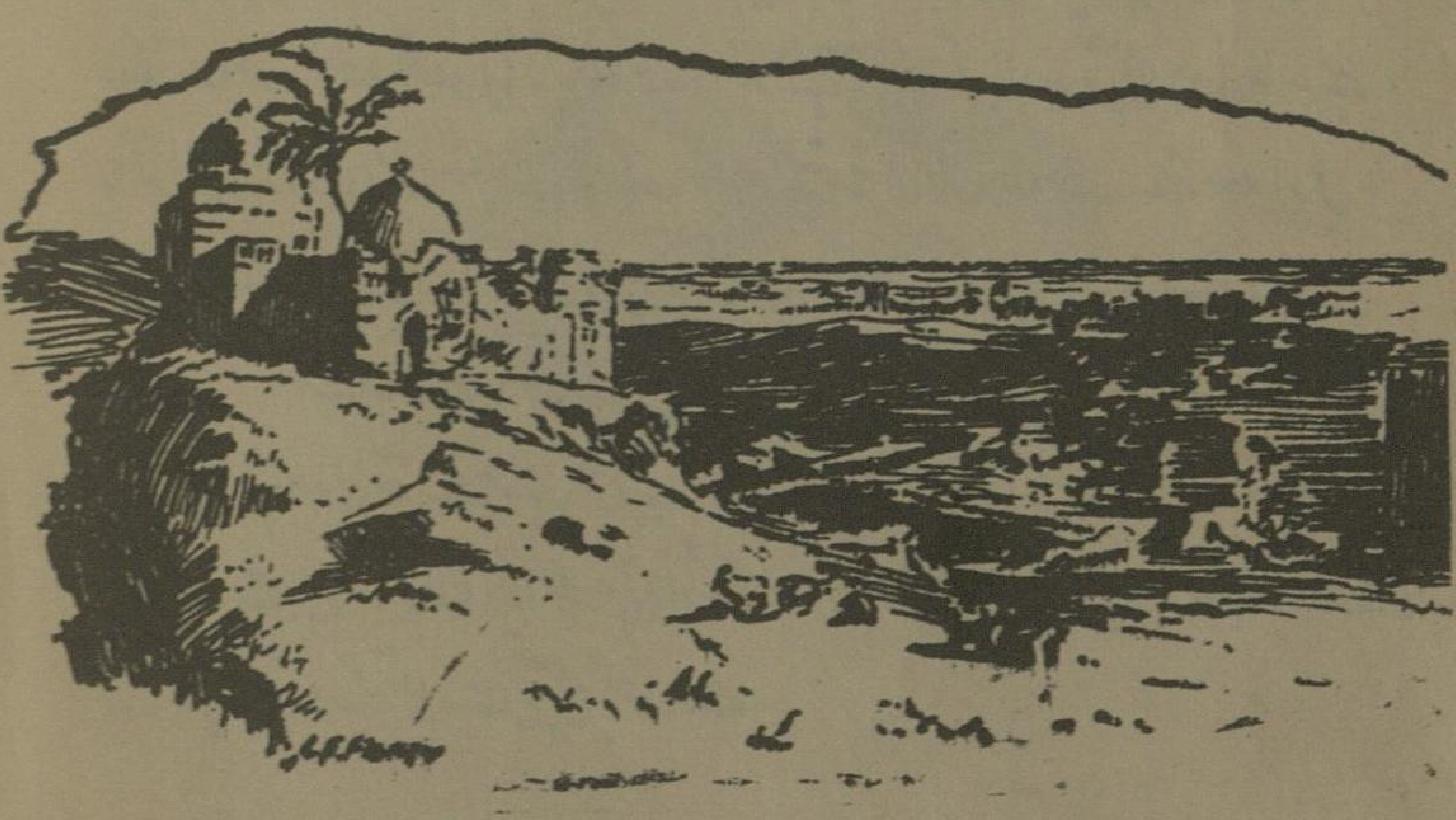
"یارانِ کہن" کا پہلا ایڈیشن ساڑھے دس سال پہلے چھپا تھا۔ سال بھر میں فروخت ہوگیا۔ اشاعتِ ثانی زیرِ غور تھی کہ سالکؔ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔
مولانا آزادؔ کے "تذکرہ" میں سالکؔ صاحب نے لکھا تھا کہ

"مولانا، مرزا غلام احمد کی غیرتِ اسلامی اور حمیتِ دینی کے قدر دان ضرور تھے، مرزا صاحب کی وفات پر مولانا نے "وکیل" امرتسر میں شذرہ لکھا، امرتسر سے لاہور آئے اور یہاں سے مرزا صاحب کے جنازہ کے ساتھ بٹالہ تک گئے۔"

یہ تحریر مولانا قدس سرہ العزیز کے علم میں آئی، تو انہوں نے اپنے سیکرٹری سے سالکؔ صاحب کو خط لکھوایا کہ یہ خلافِ واقعہ ہے، اس کی تردید و تصحیح ہونی چاہیئے، راقم الحروف کو بھی اسی مطلب کا ایک خط ملا۔ نتیجتہً سالکؔ صاحب نے ۲۳ اپریل ۱۹۵۶ء کے "چٹان" میں اس کی تردید و تصحیح فرمادی اور مذکورہ حصّہ حذف کر دیا۔

اب ساڑھے دس برس بعد "یارانِ کہن" کا یہ ایڈیشن چھپ رہا ہے، تو مولانا غلام رسول مہرؔ نے حسبِ تردید، تصحیح فرمادی ہے۔ مہرؔ و سالکؔ یک قالب و دو جان تھے۔ چونکہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کے سوانح و افکار پر بھی مہرؔ صاحب کو درخورِ وافی ہے، لہٰذا انہی کے قلم سے یہ تصحیح سجتی ہے۔

"ناشر"



فہرست

مولانا محمدؐ علی

سنہ ۱۹۱۹ء سردیوں کا دن۔ دسمبر کا مہینہ۔

رولٹ ایکٹ۔ جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام۔ مارشل لا۔ کے ہولناک ظلم۔ معاہدہ سیورے سے ترکانِ آلِ عثمان کی خلافت و سلطنت کا خاتمہ۔ ہندو مسلمان سکھ غلامی کی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد۔

امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس، پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں کے جلوس۔ گاندھی اور تلک کے استقبال، امرتسر میں پشاور سے لے کر راس کماری اور کاٹھیاواڑ سے آسام تک کے جوشیلے جوان آزادی پسندوں کا اجتماع۔ امرتسر کے باسیوں اور پردیسیوں کو صبح سے شام تک

لیڈروں کے استقبال اور ان کی تقریریں سننے کے سوا کوئی کام نہیں۔

علی برادران کی رہائی

اتنے میں خبر آئی کہ علی برادران بھی بیتول جیل سے رہا کر دیئے گئے ہیں اور وہاں سے سیدھے امرتسر آ رہے ہیں۔ شام تک نہ پہنچے۔ دوسرے دن صبح تک نہ پہنچے۔ اب اضطراب بڑھا۔ مَیں بھائی شفاعت اللہ خاں مرحوم اور مولانا سید حامد حسین بیدل شاہجہانپوری اسلامیہ ہائی سکول امرتسر کی عمارت کی دوسری منزل پر بیٹھے احباب سے باتیں کر رہے تھے۔ مولانا عارف ہسوی مرحوم پان پر پان بنا رہے تھے اور حساب لگا رہے تھے کہ اتنے بجے کی ٹرین سے علی برادران کو امرتسر پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ مولانا حسرت موہانی اپنی بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ارے میاں وہ رہا تو ہو ہی چکے ہیں۔ اپنے وقت پر آ جائیں گے۔ تشویش کاہے کی ہے۔ بیگم حسرت موہانی فرما رہی تھیں۔ مَیں تو سمجھتی ہوں فرنگیوں نے ان کی رہائی کی خبر یونہی غلط اڑا دی ہے تاکہ امرتسر کے فیصلوں پر اس کا اچھا اثر پڑے حقیقت میں انہیں رہا کرنا مقصود ہی نہیں غرض جتنے منہ تھے۔ اتنی باتیں۔

اتنے میں منادی کی آواز کان میں آئی۔ علی برادران آ رہے ہیں۔ کل دوپہر کو اتنے بجے سٹیشن پر چلو۔ یہ سن کر سب کی جان میں جان آئی۔

دوسرے دن لوگوں نے صبح ہی صبح جا کر پلیٹ فارم، ویٹنگ روم، بیرونی صحن، مکانوں کی چھتیں۔ ریل کے پُل غرض بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی ہر جگہ روک لی۔ ہزارہا انسانوں کا جم غفیر ریلوے سٹیشن سے ہال دروازے تک اور اس کے اندر

بازار میں دو رویہ مکانوں اور دکانوں کے سامنے اور کوٹھیوں پر یوں جمع ہو گیا گویا سارا ملک امرتسر ہی پر ٹوٹ پڑا ہے۔ محمدؐ علی شوکت علی بڑی بڑی قراقلی ٹوپیاں پہنے جن پر ہلال کڑھے ہوتے تھے۔ شیروانیاں اور چست پاجامے زیب تن کئے ہوتے نمودار ہوتے۔ اللہ اکبر، بندے ماترم، ست سری اکال، ہندو مسلمان کی جے، محمد علی شوکت علی کی جے، مہاتما گاندھی کی جے کے نعروں سے گنبد فلک گونج اٹھا۔

شوکت کو لوگ بہت نہ جانتے تھے۔ لیکن محمدؐ علی (کامریڈ والے) کے نام سے سب پڑھے لکھے آشنا تھے۔ کبھی دونوں بھائیوں کے چہرے صفا چٹ تھے۔ اب دونوں کے چہروں پر خوب صورت ڈاڑھیاں اور چڑھی ہوئی مونچھیں بہار دکھا رہی تھیں۔ یہ پہلا دن تھا جب مَیں نے رئیس الاحرار مولانا محمدؐ علی کی زیارت کی۔

کانگریس کے جسم میں نئی روح

جب مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کیا تو علی برادران نے "مجلس مرکزیہ خلافت" کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو تحریک خلافت کے لئے منظم کرنا شروع کر دیا۔ محمدؐ علی کانگریس میں کیا شامل ہوتے اس سُست اور جامد مجلس کی رگوں میں خونِ حیات دوڑنے لگا اور ہزارہا مسلمان جزیرۃ العرب کی سلامتی اور خلافت اسلامی کی بقا کے لئے سر بکف ہو کر میدان میں نکل آئے۔ پھر محمدؐ علی وفدِ خلافت کو لے کر یورپ گئے۔ وہاں فراعنہ فرنگ نے ان کی بات نہ سنی۔ واپس آ کر محمدؐ علی نے کہا کہ جلیانوالہ باغ اور خلافت کے مسئلوں کا فیصلہ تو ضروری ہے لیکن آزادی حاصل کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ سوراج کو قومی مطالبہ قرار دیا گیا اور ملک کے طول و عرض میں

آزادی کی تحریک کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔

بے مثال جرأتِ ایمانی

محمد علی انگریزی کے شیوا بیان انشا پرداز۔ اردو کے زوردار اخبار نویس، اور دونوں زبانوں کے فصیح اللسان خطیب تھے۔ ان کی جرأتِ ایمانی اور غیرتِ ملی مثال نہ رکھتی تھی۔ جب وہ کانگریس کے سٹیج پر بڑے بڑے عالی مرتبت اور قابل و فاضل کانگریسی رہنماؤں کے جھرمٹ میں تقریر کرتے تھے تو سٹیج لرز جاتا تھا اور قلوب سینوں کے اندر پھڑپھڑانے لگتے تھے۔ ہر شخص اندیشناک ہوجاتا تھا کہ خدا جانے محمد علی کیا کہہ دے۔ انگریز حکّام کے متعلق کسی نے خوب کہا تھا۔

The big guns at Simla respeect Mr. Gandhi, laugh at Hasrat Mohani but fear Mohammad Ali.

(شملہ کے بڑے حکّام گاندھی کا ادب کرتے ہیں۔ حسرت موہانی پر ہنستے ہیں لیکن محمّد علی سے خوف کھاتے ہیں)

وہ بار بار اعلان کرتے۔ لاطاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق۔ خدا کی نافرمانی کرکے بندوں کی فرمانبرداری نہیں ہوسکتی اور ان کی پوری زندگی اس اعلان کی عملی تصدیق تھی۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں، تقریروں میں۔ کراچی کے مقدّمے میں اور اپنی روزانہ زندگی میں ہمیشہ اس کا ثبوت دیا۔ کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکنے کو تیار نہیں۔

یہ محمد علی ہی کا اثر تھا کہ ہندوستان بھر کے جلیل القدر علمائے اسلام بھی گاندھی جی

اور ان کی تحریک کے ہمنوا ہو گئے اور انہوں نے ترکِ موالات کو اس زمانے میں اسلام کا سب سے بڑا تقاضا قرار دیا۔ محمد علیؒ "پہلے مسلمان بعد میں ہندوستانی" اور "پہلے ہندوستانی بعد میں مسلمان" کی بحث میں کبھی نہیں پڑے۔ ان کا قول تھا کہ جہاں اسلام کے احکام کا معاملہ ہو وہاں میں اوّل بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان ہوں لیکن جہاں وطن کا کوئی مسئلہ ہو۔ وہاں پہلے بھی ہندوستانی ہوں اور بعد میں بھی ہندوستانی ہوں لیکن چونکہ ان کی زندگی سراپا اسلام تھی۔ اس لئے حقیقت میں وہ مسلمان کے سوا کچھ بھی نہ تھے۔

چنانچہ جب پنڈت مالوی کی چالبازی اور ہندوؤں کے تعصّب نے تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ اور سنگھٹن اور شُدھی کے فتنے پیدا ہوئے تو محمد علی کی غیرت مندی نے ایک لمحے کے لئے بھی ہندوؤں کے ساتھ رہنا گوارا نہ کیا اور اپنے آپ کو کاملاً مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

آل پارٹیز مُسلِم کانفرنس

مجھے دہلی کی آل پارٹیز مُسلِم کانفرنس اب تک یاد ہے۔ سر آغا خاں صدر تھے جب سر محمد شفیع نے مسلمانوں کے حقوق کی قرار داد پیش کی اور مُفتی کفایت اللہ نے اس کی تائید فرمائی تو مولانا محمد علی نے ایک ترمیم پیش کی کہ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت۔ اقلیت کے صوبوں میں زائد از استحقاق نشستیں سندھ اور صوبہ سرحد میں صوبائی اصلاحات۔ بلوچستان کو حکومت خود اختیاری سب مطالبات صحیح ہیں۔ لیکن حلقہ ہائے انتخاب ——— مخلوط ہونے چاہئیں اس پر شور مچ گیا کیونکہ مسلمان مخلوط انتخاب سے سخت نفرت کرتے تھے۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ سر آغا خاں نے اٹھنے سے پہلے پیچھے مڑ کر

کہا۔ آپ لوگ محمد علی کو درست کیجئے۔ نواب اسماعیل خاں۔ قہر صاحب مَیں اور مفتی کفایت اللہ نے پنڈال سے نکلتے ہی مولانا کو جا لیا۔ نہ خود کھانا کھایا نہ انہیں کھانے دیا۔ اور بڑی حیص بیص کے بعد ان کو اس امر پر ہموار کیا کہ قرارداد میں ایک فقرہ بڑھا دیا جائے کہ اگر ہندو لیڈر مسلمانوں کے ان مطالبات کو تسلیم کر لیں تو مخلوط انتخاب کے مسئلے پر بھی غور کیا جائے گا۔

اجلاس دوبارہ منعقد ہونے پر مولانا تقریر کے ساتھ اپنی ترمیم پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آغا خاں انہیں جانتے تھے۔ انہوں نے مولانا کو بولنے نہ دیا اور سر محمد شفیع نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ مولانا نے یہ ترمیم پیش کی ہے اور مَیں اسے قبول کرتا ہوں۔ مولانا کسمسا کر رہ گئے اور قرارداد منظور ہو گئی۔

کانگریسی رہنماؤں سے جنگ

اس کے بعد مولانا محمد علی مسلمانوں کے حقوق کے لئے کانگریس اور اس کے رہنماؤں سے بھی خوب لڑے۔ لیکن تصفیۂ حقوق کے حامی ہونے کے باوجود سائمن کمیشن کو بائیکاٹ کرنے کے بھی داعی ہوتے۔ نہرو رپورٹ کی سخت مخالفت کی۔

اسی زمانے میں جب کانگریس نے نمک بنانے کی تحریک شروع کی اور گاندھی جی نے مولانا کو بھی نمک بنانے کی سول نافرمانی میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ تو مولانا نے فرمایا:۔

مَیں کیا نمک بناؤں گا۔ قوم کے غم میں دس سال سے شکر جو بنا رہا ہوں۔

(مولانا کو ذیابطیس کا عارضہ تھا)

اسی زمانے میں بعض مسلمان نوجوان بہت مضطرب تھے کہ اگر ہمارے رہنما کانگریس کی تحریک میں شامل نہیں ہوتے تو بطور خود ہی انگریز کے خلاف حریتِ وطن کی کوئی تحریک شروع کریں۔ چنانچہ وہ رہ رہ کر مولانا محمد علی سے تقاضا کر رہے تھے۔ ان کے ایک پرانے شاگرد اور عقیدت مند نے ان کو اسی مضمون کا ایک خط لکھا۔ جس کے جواب میں انہوں نے میرے نام اٹھارہ صفحے کا ایک گرامی نامہ ارسال فرمایا جس میں اسی قسم کے نوجوانوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اور لکھا کہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے اصرار کرنا بھی حریتِ وطن کی تحریک ہی کا ایک حصّہ ہے۔ جب تک مسلمان سوراج میں اپنی پوزیشن کی طرف سے مطمئن نہ ہوں گے وہ سوراج کی تحریک میں مخلصانہ کیونکر شامل ہو سکتے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھا کہ اگر سچ مچ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہم کوئی تحریک شروع کر دیں تو دس لاکھ روپیہ اور پچاس ہزار رضا کار فراہم کر دیں میں میدان میں آنے کے لئے تیار ہوں ؎

میں ہوں پروانہ مگر شمع تو ہو رات تو ہو
جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو
میں بھی موجود ہوں اظہارِ عقیدت کیلئے
کسی جانب سے کچھ اظہارِ کرامات تو ہو

انہی دنوں مفتی کفایت اللہ نے جو کانگریس کے حامی تھے کسی "قوم پرستانہ" سفر کے سلسلے میں دو سو روپے کانگریس سے بطور مصارفِ سفر وصول کئے تھے اور اتفاق سے انہی دنوں کسی تقریر میں مولانا محمد علی کے متعلق کوئی بات کہہ دی اس پر مولانا نے (محولہ بالا) خط میں لکھا۔ مفتی کفایت اللہ جن کو اب میں ـــــ کفایت اللہ کہوں گا کیونکہ ان میں

حر،، کے دو سو عدد شامل ہو گئے ہیں۔ میرے متعلق یہ افترا باندھا ہے کہ الخ اس زمانے میں مولانا ذیابیطس کی وجہ سے سوزشِ اعصاب اور ضُعفِ قلب کے مریض بھی ہو چکے تھے اور زندگی بارگراں ہو گئی تھی لیکن زورِ طبیعت بدستور تھا۔

"قندھار چلو" کے نعرے

مولانا محمد علی ترکی کے سفر سے واپس آئے تو کچھ مدت بعد جنرل نادر خان انقلاب افغانستان کے سلسلے میں فرانس سے اپنے وطن کو جا رہے تھے اور مولانا ظفر علی خاں نے ایک تحریک جاری کر رکھی تھی۔ کہ نادر خاں کو امان اللہ خاں کے پاس قندھار جانے پر مجبور کیا جاتے۔ مولانا محمد علی اور مفتی کفایت اللہ دہلی سے نادر خاں کے ساتھ ہی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ جب ٹرین لاہور کے سٹیشن پر پہنچی تو یہاں مولانا ظفر علی خاں کے رضاکاروں نے قندھار چلو، قندھار چلو کا شور مچا رکھا تھا۔ لہٰذا مولانا اور مفتی صاحب یہیں اتر پڑے۔ مَیں اور مہر صاحب ریلوے سٹیشن سے انہیں اپنے ہاں لے آئے۔ رات کو مولانا دیر تک مونگ پھلی کھاتے رہے جو انہیں بے حد مرغوب تھی۔ اور ہم ان کے پاس بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ مَیں نے پوچھا۔ مولانا آپ ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا سے ملے؟ کہنے لگے۔ نہ مَیں اس سے ملنا چاہتا تھا نہ ملا۔ البتہ ترکی کے بعض بڑے آدمیوں سے ملا تھا۔ ان میں سے بعض "ایماندار بے ایمان" ہیں اور بعض "بے ایمان ایمان دار"۔ پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ کہنے لگے بعض تو ایسے ہیں جن کی زندگیاں اسلامی ہیں۔ نماز و تلاوت کے پابند ہیں لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کے ہر ملحدانہ اور ناجائز حکم کی بھی چپ چاپ تعمیل کر رہے ہیں یہ تو ہیں "ایماندار بے ایمان" اور بعض لوگ

ایسے ہیں جو خود تو عقائد و اعمال کے لحاظ سے فسق کے پیکر ہیں لیکن ٹسوے بہاتے ہیں کہ مصطفےٰ کمال نے خلافت کو موقوف کرکے مسندِ رسول ویران کر دیا۔ یہ ہیں "بے ایمان ایماندار" ان کا مقصد اسلام نہیں بلکہ محض حریفانہ جذبے سے مصطفےٰ کمال پاشا کو بدنام کرنا ہے۔

مولانا کی بدپرہیزی

مولانا کی بدپرہیزی حدِ انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ میاں فیروز الدین احمد مرحوم خادمِ خلافت نے ان کے اعزاز میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ میں بالکل مولانا کے پاس بیٹھا تھا۔ مولانا صبح ہی سے تاکید کر رہے تھے کہ میں صرف سلاد اور رُوغن زیتون کھاتا ہوں۔ چنانچہ میں اور میاں فیروز الدین احمد لوہاری دروازے سے سلاد اور پلومر کی دوکان سے روغن زیتون تلاش کر کے لائے تھے۔ جب کھانا کھانے بیٹھے تو میں نے کہا۔ مولانا۔ کیا تھوڑی سی سلاد میں بھی لے لوں؟ کہنے لگے۔ ہاں ہاں کھاؤ۔ یہ کہہ کر بہت سی سلاد میری پلیٹ میں ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے۔ کیا یہ پلاؤ قورمہ اکیلے ہی اکیلے اُڑا جاؤ گے؟ میں نے کہا آپ شوق سے کھائیے لیکن آپ کو تو پرہیز ہے۔ کہنے لگے اجی کہاں کا پرہیز۔ یہ کہا اور سب کچھ کھانے لگے۔ میں نے بگڑ کر کہا۔ اگر یہی بات تھی تو آپ نے سلاد اور روغن زیتون کے لئے ہمیں کیوں پریشان کیا۔ کہنے لگے اب میرا قصور معاف کرو اور مجھے کھانا کھانے دو۔

محبّ و شفیق بزرگ

مولانا بے انتہا محب و شفیق بزرگ تھے اور اپنے نیاز مندوں سے دلی محبت

کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگلستان سے ان کے انتقال کی خبر ملی تو مَیں بچوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رو دیا۔ اور علّامہ اقبال بھی اپنے ہمدمِ دیرینہ کی وفات پر دیر تک ملُول و آبدیدہ رہے۔ اللّٰھم اغفرلہٗ

مولانا شوکت علی

مولانا شوکت علی کے متعلق کچھ لکھتے ہوتے مولانا محمد علی کا تصوّر بے تکلّف سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے کہ علی برادران اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں "یکجان و دو قالب" کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ تھے بھی یقیناً اسی کے مصداق۔ مولانا محمد علی اپنے علم وفضل کے اعتبار سے قطعی طور پر اپنے بھائی سے بہت بڑھے ہوئے تھے لیکن خدا پرستی۔ غیرتِ دینی۔ حمیتِ اسلامی۔ روحِ ایثار اور بہادری و بیباکی کی خوبیاں دونوں بھائیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر موجود تھیں۔ مولانا شوکت علی اپنی محبت پرور۔ بے تکلّف اور پُرخلوص طبیعت کی وجہ سے قومی کارکنوں۔ رضاکاروں اور عوام کے نزدیک اپنے بھائی سے کسی قدر زیادہ ہی محبوب تھے اس لئے کہ

مولانا محمد علیؒ کی جلالت قدر اور عظمت علمی کی وجہ سے ہر شخص ان کی خدمت میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا اور مولانا شوکت علی کی باغ و بہار مجلس میں سب ہنستے کھیلتے شریک ہوتے تھے اور ان کے اشارے پر ہنستے کھیلتے جیل خانوں میں چلے جاتے تھے۔

آدمی نہیں انجمن

مولانا شوکت علی کی ایک خصوصیت عدیم المثال تھی۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمنؐ تھے اور یہ قول رسمی یا مبالغہ آمیز نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ملک کے کسی دور دست شہر یا قصبے میں مولانا شوکت علی اکیلے جا نکلے۔ جہاں نہ کوئی خلافت کا کارکن موجود تھا نہ روپے پیسے کی فراہمی کا کوئی امکان نظر آتا تھا۔ لیکن دو چار روز ہی کے اندر صدہا نوجوان اس "انسانی مقناطیس" کے گرد جمع ہو جاتے اور مولانا انہیں اپنی دلفریب باتوں سے اپنے ہاتھوں اور آنکھوں کی مخصوص حرکتوں سے اور اپنی خاطر مدارات اور دوستانہ بے تکلفی سے گرویدہ کر لیتے۔ چند ہی روز میں اس مقام پر کارکنوں کا ایک گروہ اور رضاکاروں کا ایک جیش فراہم ہو جاتا تھا۔ خدا جانے کیونکر ہر طرف سے روپیہ برسنے لگتا اور اس شہر میں تحریک منظم ہو جاتی۔ یہاں تک کہ جب تحریکِ خلافت مصطفےٰ کمال پاشا کے الغائے خلافت کے بعد آخری دموں پر تھی اور مولانا مجلسِ مرکزیۂ خلافت کے مصارف کے لئے بہت پریشان تھے۔ ایک دن دفعتہً برما جانے کا فیصلہ کر بیٹھے۔ کارکنوں نے مشورہ دیا کہ آپ زحمت سفر برداشت نہ کیجئے۔ اب خلافت والوں کی کوئی نہیں سنتا۔ خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ لیکن وہ عزم کر چکے تھے اور کوئی انہیں روک نہ سکتا تھا۔ چنانچہ رنگون اور

مانڈلے میں چند ہی روز رہ کر وہاں کے مسلمانوں کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے بیالیس ہزار روپے کی رقم مولانا کی جھولی میں ڈال دی اور آپ سالماً غانماً واپس بمبئی پہنچ گئے

ہندوؤں سے چندے کی فراہمی

تحریک خلافت کے دوران میں ہندو مسلم اتحاد اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گیا تھا چنانچہ جب گاندھی جی نے تلک سوراج فنڈ کی فراہمی کا کام شروع کیا تو مولانا شوکت علی ان دنوں احمد آباد کے سابرمتی آشرم میں گاندھی جی کے ساتھ مقیم تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ گاندھی جی احمد آباد کے دولت مند سیٹھوں سے سوراج فنڈ کے لئے چندہ فراہم کرنے نکلے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مولانا شوکت علی بھی کار میں بیٹھ کر گاندھی جی کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ گاندھی جی جس سیٹھ سے رقم وصول کر کے آگے بڑھتے مولانا اسی سیٹھ کے پاس جا دھمکتے اور پوچھتے تم نے باپو کو کیا دیا۔ وہ مثلاً جواب دیتا کہ دس ہزار دیا ہے تو فرماتے کہ خلافت کے لئے بھی دس ہزار ہی لے کر ٹلوں گا۔ سیٹھ ناچار ان کو بھی دس ہزار دے دیتا۔ وہ پھر آگے چل دیتے۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جس نے مولانا شوکت علی کو چندہ دینے سے انکار کیا ہو۔ جب چند گھنٹے بعد گاندھی جی تین چار لاکھ روپیہ لے کر واپس آشرم پہنچے تو ان کے پیچھے ہی پیچھے مولانا بھی جا دھمکے گاندھی جی نے کہا۔ مولانا۔ ہم نے آج بڑا کام کیا۔ تین لاکھ روپیہ سوراج فنڈ کے لئے جمع کیا ہے۔ مولانا ہنس دیئے اور کہا۔ مہاتما جی تین لاکھ تو میں بھی لے آیا ہوں۔ آپ نے بھی میرے برابر روپیہ جمع کیا تو کیا تیر مارا؟

ڈیوٹی شاپ کے لئے چندہ

علی گڑھ کی انجمن ”الفرض“ کی طرف سے ہر سال طلبا کا ایک وفد ملک کے بعض بڑے شہروں کا دورہ کیا کرتا تھا اور بمبئی سے عموماً بیس پچیس ہزار روپیہ فراہم کرلیا کرتا تھا۔ جس زمانے میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ انجمن الفرض کا وفد حسب معمول بمبئی پہنچا اور چونکہ وہاں مولانا ہی سب سے بڑے ”علیگرین“ تھے۔ اور ان کی ذات نوجوانوں کے لئے بے پناہ کشش بھی رکھتی تھی۔ اس لئے وہ وفد دفترِ خلافت ہی میں مقیم ہوا اور مولانا سے تقاضا کرنے لگا کہ انجمن الفرض کے لئے چندہ جمع کرنے میں ہماری امداد کیجئے۔ مولانا کی مصروفیتیں اس زمانے میں لاانتہا تھیں۔ آئیں بائیں شائیں کرکے ٹال دیا اور کہا۔ جلدی کیا ہے بمبئی آتے ہو۔ ذرا سیر سپاٹا کرو۔ گھومو پھرو۔ چندہ بھی اپنے وقت پر ہو جائے گا۔ لڑکوں کو سیر سپاٹا خدا دے۔ وہ گھومنے پھرنے لگے۔ لیکن جب پانچ چھ دن گزر گئے تو ان میں سے بعض نے مولانا سے کہا کہ چندہ دلواتے ہو تو دلواؤ۔ ورنہ ہم خود کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے کر در در پر صدا دیں گے اور اس سے علی گڑھ کی جو توہین ہوگی اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ مولانا نے فوراً دو کاریں تیار کرائیں اور لڑکوں کو ساتھ لے کر ایک سیٹھ کے ہاں پہنچے۔ دیہ غالبؔ یوسف سوبانی تھے) وہاں جاتے ہی کہا۔ دیکھو سیٹھ۔ یہ لڑکے علی گڑھ سے آئے ہیں اور میری جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔ پچیس ہزار مانگتے ہیں چک لکھو اور میری جان چھڑاؤ۔ سیٹھ نے بلا حیل وحجت پچیس ہزار کا چک کاٹ کر پیش کر دیا۔ مولانا نے لڑکوں کے حوالے کیا اور کہا اب سیدھا علی گڑھ کا ٹکٹ لو اور بھاگ جاؤ۔

گوشت پوست کا پہاڑ

جن لوگوں نے علی گڑھ کے رسالہ "اولڈ بوائے" میں شوکت بھیّا کا مضمون علی گڑھ کے کھلنڈرے پڑھا ہے وہ ان کی کالج کی شرارتوں۔ بے تکلّفیوں اور ظریفانہ اسلوب بیان سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے ہم عصر طلبہ ان کو ہمیشہ بڑے بھیّا کہتے اور ہمیشہ ان کو چھیڑ کر ان کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ جس زمانے میں سر آغا خاں نے مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے ملک کا دورہ کیا۔ تو شوکت بھیا اس کام میں مدد دینے کے لئے ان کے سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ لیکن آغا خاں کے سیکرٹری کے لئے جس متانت و سنجیدگی کی ضرورت تھی وہ ان سے کوسوں دُور تھی۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ بمبئی میں کرسمس یا کسی اور تقریب کا میلہ لگا ہوا تھا۔ شوکت بھیا اپنے یاروں کو ساتھ لے کر اس میلے میں چکّر لگا رہے تھے۔ ایک جگہ کیا دیکھا کہ ربڑ کا ایک بہت بڑا گولہ باکسنگ کی مشق کے لئے لگا ہوا ہے۔ فوج کے گورے اس گولے کو مکّہ مارتے ہیں اور ساتھ ہی ایک پیمانے کی گھڑی لگی ہوتی ہے۔ جس کی سوئی "مکّے" کی شدّت اور تندی کو ریکارڈ کر رہی ہے۔ شوکت بھیّا پر عالم شباب تھا اور ان میں قوت بقدر جُثّہ سے بھی زیادہ ہی تھی مچل گئے کہ ہم بھی مُکّہ ماریں گے۔ ساتھیوں نے کہا کہ تم آغا خاں کے سیکرٹری ہو۔ ذرا وقار و تمکنت سے رہو۔ یہ کیا بازاری حرکت ہے، لیکن یہ کہاں باز آنے والے تھے۔ آگے بڑھ کر اس گولے پر اس شدت کا مکّہ رسید کیا کہ پیمانے کی سوئی پورا چکّر کاٹ گئی۔ اور گورے حیران ہو کر شوکت بھیّا کو دیکھنے لگے۔ ان پر کی پھبتی ان ہی گوروں میں سے کسی نے کسی تھی۔

تنظیم کی بے پناہ قوّت

کچھ مدت بعد جنگِ عظیم اوّل چھڑ گئی۔ شوکت بھیا نے انجمنِ خدّامِ کعبہ کی بنیاد ڈالی کر انگریز کو چھیڑنا شروع کیا۔ اُدھر مولانا محمد علی نے "ترکوں کی پسند" کے عنوان سے ایک بے نظیر مضمون لکھ دیا۔ چنانچہ دونوں بھائی گرفتار کر لئے گئے اور چھندواڑہ اور بیتول (سی پی) کے جیلوں میں دن گزارنے لگے۔ انہی دنوں دونوں بھائیوں نے قرآن حکیم سے اپنا رابطہ اُستوار کیا۔ انگریزی لباس کو خیرباد کہا اور ڈاڑھیاں چھوڑ دیں۔ شوکت علی کے شیرِ ببر کے سے چہرے پر ڈاڑھی کی رونق دیکھنے کے لائق تھی۔

جنگ کے خاتمہ پر جب رولٹ بل ایجی ٹیشن۔ پنجاب میں مارشل لا اور جلیانوالہ باغ وغیرہ کے حوادث گزر چکے۔ تو امرتسر میں کانگریس۔ لیگ اور خلافت کے اجلاس ہوتے۔ اس موقع پر علی برادران بھی رہا ہو کر امرتسر پہنچے۔ محمد علی تو تعلیمیافتہ طبقے اور ملکی لیڈروں کی صفِ اوّل میں ممتاز درجہ رکھتے ہی تھے لیکن شوکت کے اثر و نفوذ کا بھی کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ چنانچہ امرتسر سے فارغ ہوتے ہی شوکت زمین کا گز بنے ہوتے ہندوستان کے طول و عرض کو ناپنے لگے۔ محمد علی تو وفدِ خلافت لے کر انگلستان چلے گئے لیکن مولانا شوکت علی نے ان کی غیر حاضری میں پورے ملک کو فرنگی سے ٹکر لینے کے لئے تیار کر دیا۔

لطیفوں کا مخزن

مولانا شوکت علی جن خوبیوں کی وجہ سے ملک بھر کے نوجوانوں کے محبوب تھے

اُن میں اِن کی بے پناہ ظرافت بہت ممتاز تھی اور ان کی ہر بات اور ہر حرکت میں قہقہوں کا سامان موجود تھا۔ ایک دن کسی نے پوچھا کہ آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں کا تخلص گوہر اور مولانا محمد علی کا جوہر ہے۔ آپ کا کیا تخلص ہے؟ بے تکلّف کہا کہ شوہر۔

کسی انگریز پرست بڑے آدمی نے ایک مجلس میں کہہ دیا کہ یہ محمد علی شوکت علی تو لفنگے ہیں۔ مولانا شوکت علی کو کسی نے بتا دیا کہنے لگے بات تو اس نے ٹھیک کہی۔ ہم لفنگے ضرور ہیں۔ لیکن "اللہ میاں کے لفنگے" ہیں کافروں کے لفنگے نہیں۔

مولانا شوکت عربی نہیں جانتے تھے لیکن جب کبھی بعض عرب بزرگ ان سے ملنے آتے تو مولانا ان سے عربی میں باتیں کرنے کی کوشش کرتے یعنی عربی کے دو تین سُنے سُنائے لفظ کہے اور جو کمی رہ گئی وہ ہاتھوں اور آنکھوں کے بلیغ اشاروں سے پوری کر دی۔ مثلاً ایک عرب سے باتیں کر رہے تھے۔ یا شیخ، المسلمون نائمون (آنکھیں بند کر لیں) فی کل عالم نائمون (انگلی فضا میں گھمائی) خلوص مافش۔ فلوس مافس۔ خیر۔ ان اللہ علی کل شیئ قدیر (اور اوپر اللہ کی طرف اشارہ کر دیا)

ایک دن چند نوجوان سر ہو گئے کہ آپ عربی تو جانتے نہیں عربی میں باتیں کیسے کر لیتے ہیں کہنے لگے "واہ عربی کیوں نہیں جانتے۔ ہم خوب عربی جانتے ہیں" کسی لڑکے نے پوچھا۔ اچھا یہ تو بتائیے گھٹنے کو عربی میں کیا کہتے ہیں۔ بے تامل جواب دیا۔ "گھٹنا تو عرب میں ہوتا ہی نہیں"۔ لڑکے مارے قہقہوں کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

پوشاک و خوراک

اچھا پہننے کا شوق تو کھدر کے رواج نے خاک میں ملا دیا تھا۔ کھلے کھلے جابر جھلا سے کپڑے پہنتے تھے اور گلے میں ایک "تھیلا خلافت" لٹکائے رہتے تھے۔ جس میں کچھ خطوط۔ کچھ پمفلٹ اور خدا جانے کیا الا بلا بھری رہتی تھی۔ البتہ سر پر سمور کی بڑی ٹوپی ضرور اوڑھتے۔ جس پر ایک بڑا سا ہلال کڑھا ہوا ہوتا تھا۔ بعد میں وہ ٹوپی بھی کھدر کی ہو گئی تھی۔ لیکن علی برادران کی انفرادیت لباس میں بہر حال نمایاں رہی۔ دونوں بھائیوں نے گاندھی ٹوپی ایک دن بھی پہن کے نہیں دیکھی۔ کیونکہ وہ ان کے ذوق کو پسند آ ہی نہ سکتی تھی۔ اچھا کھانے کا شوق ہمیشہ رہا۔ نوعیت اور مقدار دونوں اعتبار سے خوب کھاتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لذتِ کام و دہاں کے غلام تھے۔ ایک دن مدراس میں سیٹھ جمال کے ہاں دعوت تھی۔ بیسیوں قسم کے کھانے موجود تھے۔ مولانا ہر کھانے پر بڑھ بڑھ کر ہتے مار رہے تھے اور ساتھ ہی کہتے جاتے تھے کہ جو خدا ایسے لذیذ کھانے کھلاتا ہے اگر اس کی خاطر کبھی سوکھی روٹی بھی کھانی پڑے گی تو اسی ذوق شوق سے کھاؤں گا۔

سب کچھ لٹا دیا

تحریکِ خلافت کے زمانے کے بعد ہمارے ملک میں اکثر سیاسی لیڈر سب سے پہلے اپنی مادی و مالی حالت کو درست کرنے کی فکر میں مصروف ہو گئے اور اب تک یہی مذاق عام ہے لیکن مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ

میں لٹا دیا۔ رام پور میں خاصی جائیداد تھی وہ بھی خالصے لگ گئی اور جب دنیا سے رخصت ہوتے تو مال کے نام سے تو کچھ نہ چھوڑا۔ البتہ خدا و خلق کے نزدیک اپنی سلکھ کو اس قدر بلند کر گئے کہ اس کا مقابلہ آج تک کسی لیڈر سے نہ ہو سکا۔

مسلم ٹاؤن میں آخری پھیرا

اواخر عمر میں جب مولانا شوکت علی قائد اعظم کے ماتحت لیفٹیننٹ کی حیثیت سے مسلم لیگ کا کام کر رہے تھے۔ ایک دفعہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی وزارت قائم کرنے کی غرض سے گئے۔ راستے میں لاہور اُترے۔ کسی نے ذکر کیا کہ سالک اور مہر نے مسلم ٹاؤن میں نہر کے کنارے اپنے مکان بنوائے ہیں۔ مولانا نے خدا کا بہت شکر ادا کیا اور کہا کہ میں ابھی جا کر ان دونوں بھائیوں کے مکان دیکھوں گا۔ چنانچہ تشریف لائے اور کوئی تین گھنٹے تک میری کوٹھی کے سبزہ زار کو اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے لالہ زار بناتے رکھا۔ چندہ جمع کرنے سے کسی حال میں غافل نہ رہتے تھے۔ چنانچہ میرے سر ہو گئے کہ چندہ دو۔ میں نے کہا۔ مولانا اخبار نویسوں سے چندہ نہیں مانگا کرتے۔ ہم لوگ لکھ لکھ کر آپ کو چندہ دلواتے ہیں خود چندہ دینا ہمارا کام نہیں۔ پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ لیڈر چندہ کھا جاتے ہیں۔ آپ اپنی ذات کیلئے کوئی حکم دیجئے اس کی تعمیل ہو گی۔ اس پر ہنسنے لگے اور شریر شیطان وغیرہ کہہ کر فرمایا۔ اچھا میرے لئے ہوانا سیگاروں کا ایک ڈبہ منگا دو۔ میں نے کہا۔ بہت خوب چلئے میں آپ کے ساتھ شہر چلتا ہوں اور ڈبہ لے دیتا ہوں۔ چنانچہ سیگاروں کا ڈبہ لے گئے۔

پاکستان کے قیام کی بُنیاد

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب برِّصغیر کے مسلمانوں کو مولانا شوکت علی جیسا بے پناہ کارکُن۔ ایثار پیشہ لیڈر اور بیباک مجاہد مشکل ہی سے ملے گا جن کارکنوں۔ رضاکاروں اخبار نویسوں اور دوسرے قومی خادموں نے مولانا شوکت علی کے ساتھ کام کیا ہے وہ آج بھی ان کا نام لیتے ہیں تو آبدیدہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں ویسے خلوص اور ویسی محبت کا نام ونشان بھی آجکل کے رہبرانِ ملّت میں نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بھائیوں نے برِّصغیر کے مسلمانوں کو جذبات اسلامی سے مالامال کرنے میں جو حیرت انگیز خدمت انجام دی وہی پاکستان کے قیام کی بُنیاد ثابت ہوئی۔ اگر مسلمانوں میں دینی غیرت اور ملّی شعور بیدار نہ ہوتا تو وہ ہرگز اس قدر منظم اور متقاضی نہ ہو سکتے کہ اس ملک میں اپنی ایک آزاد مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ جب تک اس برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود باقی ہے۔ مولانا شوکت علی کا نام آفتاب کی طرح درخشندہ رہے گا۔

علامہ اقبال

ڈاکٹر اقبال ہمارے عصر کے نابغۂ اعظم تھے۔ جن کی شخصیت نصف صدی تک ہمارے ملک کے علم و ادب۔ ملتِ اسلامی کے افکار و تصورات اور شعر و سخن کی مجالس پر ابرِ رحمت بن کر چھاتی رہی۔ آج وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا فکر آج بھی پڑھے لکھے مسلمانوں کے خیالات کی رہنمائی کر رہا ہے اور مدت دراز تک کرتا رہے گا۔ اقبال اُردو اور فارسی کا شیوا بیان شاعر۔ اتحادِ عالم اسلامی کا انتھک مبلّغ دنیا کا ایک نامور فلسفی اور اسلام کے اقدار و معیارات کا بدیع المثال محافظ اور مفسّر تھا۔ اور یہ کہنا ذرا بھی مُبالغہ میں شامل نہیں کہ مولانا رومؔ کے بعد عالم اسلام میں اس شان کا شاعر اور مفکّر صرف اقبال تھا۔

درخواست تلمّذ کا جواب

مجھے مدۃ العمر اقبال کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل رہا۔ ان کی شہرت اس صدی کے اوائل ہی میں قائم ہو چکی تھی۔ انجمنِ حمایت اسلام کے جلسوں میں ان کی نظمیں سُننے کے لئے ہزاروں اشخاص جمع ہو جاتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں میری عمر چودہ برس کی ہوگی کہ مجھے شعر کہنے کا شوق ہوا۔ مَیں نے علامہ اقبال کو تلمّذ کے لئے خط لکھا۔ جس کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ ہر شخص کو طبیعت آسمان سے اور زبان زمین سے ملتی ہے۔ اگر آپ کی طبیعت شاعرانہ ہے تو آپ خود بخود شعر گوئی پر مجبور ہوں گے۔ باقی رہی زبان۔ تو اس کے لئے مَیں موزوں استاد نہیں ہو سکتا۔ مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک بے پیرا فن ہے۔ لوگ اس مثل کو شاعری کی تحقیر کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک اس میں حکمت پوشیدہ ہے۔ شعر کے لئے کسی پیر استاد کی ضرورت نہیں لیکن اگر تلمّذ پر مصر ہی ہوں تو مَیں داغ کے دو قابل شاگردوں کے نام لکھتا ہوں۔ ان میں سے کسی سے رجوع کیجئے۔ منشی حیات بخش رسا شاعر دربار رام پور۔ اور سیّد محمد احسن مارہروی۔

انار کلی میں

اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں مجھے لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو مَیں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں آپ انار کلی بازار کے ایک بالاخانہ میں رہتے تھے جس کی جگہ اب شوکت مارکٹ تعمیر ہو چکی ہے۔ اس زمانے میں بھی علّامہ کی وضع

یہی تھی کہ ایک آرام کرسی پر بنیان پہنے اور تہمد باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ حقّہ لگا رہتا تھا۔ سردیوں میں اس لباس پر ایک کشمیری دھسّے کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ آس پاس کتابیں بکھری رہتی تھیں۔ کرسی کے ساتھ ہی ایک بستر لگا رہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو بستر پر استراحت فرماتے۔ منشی طاہر الدین (موجد ''دل روز'') ان کے منشی تھے۔ جو وکالت میں ان کی مدد کرتے تھے۔ خادم خاص علی بخش تھا جو آخر دم تک رہا اور اب بھی ''جاوید منزل'' ہی میں پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سرخ و سفید۔ وجیہہ و شکیل آدمی تھے۔ ان کا عام لباس ترکی ٹوپی یا پشاوری لنگی۔ چھوٹے کوٹ اور شلوار پر مشتمل تھا عدالت جاتے وقت انگریزی سوٹ پہنتے لیکن اس کو پسند نہ کرتے تھے اور گھر آتے ہی فی الفور اس سے چھٹکارا حاصل کرتے۔

درد و گداز

مَیں اکثر حاضر ہوتا اور ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے مستفیض ہوتا۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس سے کچھ کم تھی۔ لیکن نوجوانی کی رنگ رلیاں ترک کر چکے تھے اور اسلامیات کے وسیع مطالعہ اور قرآن حکیم پر تدبّر و تفکّر میں مصروف تھے۔ چونکہ اہل دل کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے طبیعت میں سوز و گداز تھا۔ مَیں نے بارہا دیکھا کہ جوانی کے دَور میں بھی جب کبھی دوران گفتگو میں حضور سرور کائنات صلعم کی رافت و رحمت کا ذکر آجاتا تو ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونا شروع کر دیتے۔ اور دیر تک طبیعت نہ سنبھل پاتی۔

مجھے نوٹس

اس کے بعد مَیں نے ۱۹۱۴ء میں پٹھان کوٹ سے رسالہ "فانوسِ خیال" جاری کیا۔ ایک دفعہ کسی اخبار میں ڈاکٹر صاحب کی ایک چھوٹی سی نظم نظر آئی جو مَیں نے فانوسِ خیال میں نقل کر لی۔ چند روز بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک رجسٹرڈ نوٹس دے دیا کہ مَیں نے آپ کو اپنا کلام اشاعت کے لئے نہیں دیا۔ پھر آپ نے میری نظم کیوں شائع کی۔ مَیں بے حد پریشان ہوا۔ والد محترم سے ذکر کیا۔ ان کے ایک دوست محمد فاضل پٹھانکوٹ میں ٹھیکہ داری کرتے تھے اور سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کے بے تکلف دوست بھی واقع ہوتے تھے وہ کہنے لگے۔ تم فکر نہ کرو۔ اقبال کے دماغ میں قانون کا فتور ہے۔ اس دفعہ لاہور جاؤں گا تو اس فتور کا علاج کر دوں گا چنانچہ انہوں نے لاہور آ کر ڈاکٹر صاحب کو اس حرکت پر ملامت کی۔

۱۹۱۵ء کے اواخر میں مَیں دوبارہ لاہور آیا اور اس وقت سے ۱۹۳۸ء تک تیئس سال کی مدت میں کوئی ہفتہ بھی ایسا نہ گزرا کہ مَیں ایک دو دفعہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہوں۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں قیدِ فرنگ کی وجہ سے محروم نیاز رہنا پڑا۔ لیکن جب واپس آیا تو ڈاکٹر صاحب اس تپاک اور خلوص سے ملے کہ مَیں بھی آبدیدہ ہو گیا اور وہ بھی اشکبار ہوتے اور دیر تک مجھے الدنیا سجن المومن کا مطلب سمجھاتے رہے۔ اس زمانے میں آپ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔ اور چودھری محمد حسین مرحوم سے ارتباط بہت بڑھ گیا تھا جو صبح و شام حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور

ڈاکٹر صاحب کو ان کی تصانیف کی ترتیب و تہذیب میں مدد دیا کرتے تھے۔ میرا اور مہرؔ صاحب کا معمول یہی تھا کہ جب بھی وقت ملتا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر گھنٹوں بیٹھتے اور اکثر رات کے دس گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب ہمیں اپنی غیر مطبوعہ نظمیں نہایت دلفریب ترنّم میں سنایا کرتے۔ یہ سعادت صرف ہم تینوں ہی کو حاصل تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب اپنا کلام سنانے میں بے حد بخیل واقع ہوتے تھے۔

ایک اور نوٹس

دارالاشاعت پنجاب سے سیّد امتیاز علی تاج نے ایک ماہانہ رسالہ "کہکشاں" جاری کیا۔ اس میں کہیں مَیں نے ڈاکٹر صاحب کی ایک نظم درج کر دی۔ جسے وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھ چکے تھے۔ حسبِ عادت ڈاکٹر صاحب نے سیّد امتیاز علی کو بھی ایک نوٹس بھیجدیا۔ جس پر مَیں نے خدمت میں حاضر ہو کر کسی قدر تلخ کلامی کی اور کہا کہ آپ اپنی بیرسٹری کا استعمال اپنے نیازمندوں پر نہ کیا کیجئے۔ چند سال پیشتر آپ نے مجھے نوٹس دے دیا تھا۔ اب امتیاز کو دے دیا۔ اور اس کو بھی مَیں اپنے نام ہی نوٹس سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ کہکشاں کی ترتیب میرے سپرد ہے۔ کسی قدر بحث کے بعد ڈاکٹر صاحب ٹھیک ہو گئے اور قصّہ گیا گزرا ہوا۔

دِلکش ترنّم

مَیں نے متعدد بار ڈاکٹر صاحب کو عام مجمعوں میں نظمیں سناتے دیکھا ہے۔ انجمن حمایت اسلام کے چند جلسوں کے علاوہ "جوابِ شکوہ" موچی دروازے کے باہر

باغ میں۔ اور "طرابلس کے شہیدوں کا لہو" بادشاہی مسجد میں پڑھی گئیں۔ دونوں موقعوں پر میں موجود تھا۔ نظموں کو ترنّم سے پڑھنے کا شعار سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب ہی نے اختیار کیا تھا اور چونکہ موسیقی کے مبادی سے باخبر ہونے کے علاوہ ان کی آواز میں شیرینی اور لہجے میں سوز و گداز تھا۔ اس لئے ہزاروں کا مجمع مسحور و مبہوت ہو جاتا تھا۔ بعض موقعوں پر میں نے دیکھا کہ شعر خوانی کے دوران میں ڈاکٹر صاحب کے آنسو ان کے رخساروں پر بہہ رہے ہیں اور آواز کے سوز میں زیادہ گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کیفیت حاضرینِ مجلس تک متعدّی ہو جاتی اور آہ و فریاد کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگتیں۔

قرآن حدیث فقہ

ڈاکٹر صاحب جدید و قدیم علوم کے جامع تھے۔ قرآن مجید سے ان کو عشق تھا۔ ہر روز صبح کے وقت خوش الحانی سے تلاوت کرتے اور اکثر اشکبار ہو جاتے قرآن کے معارف پر ژرف نگاہی سے غور کرتے۔ اور ایسے ایسے بیش بہا نکات بیان فرماتے جو اس سے قبل کسی مفسّر کو نہ سوجھے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ آج کل کے انسان میں معارفِ قرآنی کے فہم کی صلاحیت قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ گذشتہ چودہ سو سال میں انسان نے فکری اور سائنسی علوم میں جو ترقّی کی ہے اس نے قرآن کو آسان تر کر دیا ہے اور تسخیر کائنات کے سلسلے میں انسان جو کچھ کر رہا ہے وہی قرآنی تعلیمات کا منشا ہے۔ حدیث کے عاشق تھے کیونکہ ان کے عشقِ رسول کا طبعی تقاضا یہی تھا۔ حضور صلعم کی حکمت بالغہ کا تصوّر کر کے اکثر

رو پڑتے۔ البتہ قانونی اہمیت کی حدیثوں کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ اگر حضور صلعم نے کوئی قانونی فیصلہ کیا ہے تو دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ فیصلہ کن حالات میں صادر ہوا۔ اگر حالات وہی ہیں تو فیصلہ بھی وہی قائم رہے گا اگر حالات مختلف ہیں تو فیصلہ بھی حدیث سے مختلف ہوگا۔ کیونکہ اختلافِ زمان سے اختلافِ احکام فقہا کا مسلمہ اصول ہے۔ ایسی صورت میں حدیث کے الفاظ کی جگہ اس کی روحیت اور معنویت پیشِ نظر رکھنی ہوگی۔

فقہِ اسلامی کے متعلق ڈاکٹر صاحب عمر بھر یہی کہتے رہے کہ بلا شُبہ ہمارے فقہا و مجتہدین نے فقہ پر بڑی محنت کی ہے اور ان کی یہ محنت صرف قابلِ داد و تحسین ہی نہیں بلکہ اس سے ہر دور کے مسلمانوں کو استفادہ کرنا چاہیئے۔ لیکن آج کے دَور میں ضرورت ہے کہ اصولِ فقہ کو زمانہ حال کی "جیورس پروڈنس" کے انداز پر از سرِ نو مدوّن کیا جائے تاکہ ہم مسلمانوں کے لئے نہایت واضح نظامِ شریعت بھی مہیا کر سکیں اور دنیا کو یہ بھی بتا سکیں کہ ہمارا قانون دنیا بھر کے قوانین و شرائع پر ہزار وجوہ فضیلت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ کام خود کرنا چاہتے تھے لیکن انسانی عمر بہت کوتاہ ہے۔ اور کام بہت ہی بڑا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام کسی ایک آدمی کے کرنے کا بھی نہیں۔ اس لئے وہ محض اصول پیش کر سکے اور اپنے ہر خطبے میں انہوں نے مسلمان اہلِ شریعت اور ماہرینِ قانون کی توجّہ اس کام کی طرف مبذول کرائی۔ اب اگر مستقبل میں اہلِ علم اور اہلِ فکر کی کوئی جماعت اس کام کی تکمیل پر کمر بستہ ہوگی تو یہ بھی ڈاکٹر اقبال ہی کی تلقین و ہدایت کا نتیجہ ہوگا۔

ادبیات کی رہنمائی

اسلامی ادبیات کا رخ بدلنے میں بھی ڈاکٹر اقبال کی خدمات بے حد قابلِ قدر ہیں انہوں نے اُردو کی شاعری کو مریضانہ زارنالی۔ حسرت و حرماں اور مایوسی و اُفتادگی سے نجات دلا کر حیات افروز اور جذبہ انگیز خیالات نظم کرنے پر آمادہ کیا اور "ادب برائے ادب" کے نظریہ کو باطل قرار دے کر ادب کے روابط زندگی کے ساتھ اُستوار کئے۔ فارسی اس ملک میں مر رہی تھی۔ اس کو چند سال کے لئے حیات تازہ دے دی اور اس زبان کے ذریعے سے اپنے افکار و خیالات ساری دنیا ئے اسلام تک پہنچا دیئے جلیل القدر شاعر اور عظیم الشّان فلسفی ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ظرافت اور تفنّن کا ذوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ انقلاب کے "افکار و حوادث" کو بڑے شوق سے پڑھتے اور اکثر کہا کرتے کہ سالک کے افکار و حوادث میں ایک ہی خرابی ہے کہ بہت کم ہوتے ہیں۔ مزا آنے لگتا ہے تو کالم ختم ہو جاتا ہے۔ آپ صبح سے شام تک بے شمار آنے والوں سے علمی، سیاسی، ادبی، فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو کرتے اور معلومات کا دریا رواں رہتا۔ لیکن ان کی خوش طبعی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ان مذاکرات کو کبھی گراں بار اور غیر دلکش نہ ہونے دیتی۔

آم سے شوق

ڈاکٹر صاحب کو آم کھانے کا بے حد شوق تھا ہر سال میاں نظام الدّین مرحوم ہم لوگوں کو اپنے باغات میں آم کھانے کی دعوت دیتے۔ اور ہم ڈاکٹر صاحب کی صدارت

میں صبح سے جو آم کھانا شروع کرتے تو یہ سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ اس محفل میں چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اپنی بے پناہ انبہ خوری کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی پھبتیوں اور لطیف چوٹوں کا نشانہ بنتے۔ اور مَیں۔ مہر۔ تاثیر۔ میاں اسلم عبدالرحمٰن چغتائی۔ حکیم یوسف حسن۔ میاں امیرالدین اور دوسرے احباب آم کھانے اور قہقہے لگانے کے سوا اور کچھ نہ کرتے۔ جب ڈاکٹر صاحب علالتِ طبع کی وجہ سے معالج کے حُکم کے تحت آم کھانے سے محروم ہو گئے تو بے حد مضطرب ہوتے اور کہنے لگے کہ مرنا تو برحق ہے۔ پھر آم نہ کھا کر مرنے سے آم کھا کر مرجانا بہتر ہے۔ حکیم نابینا صاحب سے اصرار کر کے ایک آم روزانہ کھانے کی اجازت حاصل کر لی۔ ایک دن میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے ایک پلیٹ میں کوئی سیر بھر کا بمبئی آم رکھا ہے اور ڈاکٹر صاحب اس کو کھانے کے لئے چھُری اٹھا رہے ہیں۔ میں نے کہا آپ نے پھر بد پرہیزی شروع کر دی۔ کہنے لگے نہیں۔ حکیم صاحب نے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت دے دی ہے اور یہ آم بہرحال ایک ہی آم تو ہے۔

اس زمانے میں جب بہاولپور۔ ملتان۔ شجاع آباد سے کوئی آموں کی ٹوکری بھیجتا تو علی بخش کو بھیج کر مجھے اور مہر صاحب کو بلوا لیتے۔ قالین کے فرش پر اخبار بچھا کر ایک دیگچے میں پانی سے آم تر کئے جاتے۔ ہم لوگ بیٹھ کر کھانے لگتے۔ اور ڈاکٹر صاحب صوفے پر بیٹھے ہوتے دیکھتے رہتے۔ ایک دن کہا۔ اب مَیں کھانے کی منزل سے گزر کر کھلانے کے مرحلے میں ہوں اور مجھے آم کھلا کر بھی مسرّت ہوتی ہے۔ مَیں نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ تو وہی بات ہوئی "پیشہ کند دلالی" ہنسے اور کہنے لگے۔ مجھے یقین

تھا کہ سالکؔ صاحب یہ مصرع پڑھے بغیر نہ رہیں گے۔

آواز بیٹھ گئی

مرنے سے چند سال پہلے آواز بیٹھ گئی تھی جو یونانی ڈاکٹری اور ریڈیائی غرض کسی علاج سے بھی درست نہ ہوئی اور اس بلبل ہزار داستان کے چہچہے ختم ہو گئے۔ زیادہ باتیں ہمیں لوگ کیا کرتے اور ڈاکٹر صاحب بہ تکلّف چند فقرے ارشاد فرماتے۔ آخری دو تین سال کی مدّت میں چودھری محمد حسین۔ میاں محمد شفیع (جرنلسٹ) سیّد نذیر نیازی اور راجہ حسن اختر۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے۔ مہر صاحب کبھی کبھی جاتے اور ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر مضطرب واپس آتے۔ ڈاکٹر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ حجاز جائیں اور فریضہ حج ادا کر کے اماکن مقدّسہ کی زیارت سے مشرّف ہوں۔ لیکن روز افزوں بیماری کے باعث یہ مبارک ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے تصوّر ہی میں حجاز کا سفر اختیار کر کے اپنے تاثرات "ارمغانِ حجاز" میں بیان کر دیے جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔

مَیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق متعدد مضامین لکھ چکا ہوں۔ اپنی "سرگزشت" میں جابجا ان کا تذکرہ کر چکا ہوں بلکہ "بزمِ اقبال" کی فرمائش پر ان کی پوری سوانح عمری بھی "ذکر اقبال" کے نام سے تالیف کر چکا ہوں۔ اس لئے اس چھوٹے سے مضمون میں کوئی ایسی بات بیان نہیں کر سکتا جو پہلے نہ لکھی جا چکی ہو۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

خدا کی قدرت ہے کہ جو شخص عمر بھر مسلمانوں کی حُریّت اسلامی حکومت اور اتّحاد المسلمین کی دعوت دیتا رہا اور جس نے مرنے سے سات سال پیشتر مسلمانوں کو پاکستان کا نصب العین

بھی دے دیا۔ اپنے اس خواب کی تعبیر نکلنے سے نو سال پیشتر ہی اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں پہنچ گیا۔ اور "لواتے پاکستانِ آزاد" کو لہراتا ہوا نہ دیکھ سکا۔ لیکن جب تک پاکستان قائم ہے۔ یہی جھنڈا لہرا لہرا کر پاکستانیوں کو اقبال کی یاد دلاتا رہیگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

جس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی بے ریش و بُروت انسان تھے اور نوعمری کے باوجود علم و فضل اور لسانی و طراری کے اعتبار سے اپنے ہمسروں اور ہمعصروں سے کوسوں آگے تھے۔ بمبئی میں آغا حشر۔ ابونصر آہ۔ اور نظیر حسن سخا کے ساتھ عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کیا کرتے تھے اور اپنے اہتمام سے ایک ماہانہ رسالہ "بلاغ" بھی نکالتے تھے۔

لیکن یہ زمانہ بہت مختصر ثابت ہوا ــــ آغا حشر کو ایک تھیٹریکل کمپنی میں ڈرامے رکھنے کا کام مل گیا مولانا ابوالکلام اور ان کے بھائی ابونصر غلام یاسین آہ کلکتے چلے گئے۔ وہاں سے ابوالکلام لکھنؤ جاکر مولانا شبلی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ کیونکہ ہندوستان

میں مسلمانوں کے جو اصلاحی اور تعلیمی ادارے اس وقت کام کر رہے تھے، ان میں سے صرف ندوۃ العلماء ہی تھا جس کے اصول وعمل سے مولانا ابوالکلام متفق ہو سکتے تھے،

ابوالکلام اور الہلال

مولانا شبلی نوعمر ابوالکلام آزاد کی علمیّت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے "الندوہ" کی ادارت انہیں سونپ دی۔ مولانا کی نوعمری کی وجہ سے اکثر بزرگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ جو فاضل جلیل "الندوہ" میں مضامین لکھتا ہے وہ یہی لڑکا ہے بلکہ مولانا حالی تو ایک دفعہ مولانا ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام آزاد کا صاحبزادہ سمجھ بیٹھے تھے اور بعد میں بیحد حیرت اور ندامت کا اظہار کیا تھا۔ موجودہ صدی کے عشرۂ دوم کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کا صحیفہ "الہلال" اس شان وشوکت سے خطابت وصحافت کے اُفق پر جلوہ گر ہوئے کہ ملک بھر کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ مسلمانوں کو اس سے پیشتر نہ تو ایسے روشن طبع۔ طبّاع وطرّار اور ادیب وخطیب عالم دین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور نہ ایسا اخبار ہی کبھی جاری ہوا تھا۔ جو اعلیٰ درجے کے کاغذ پر۔ نسخ ٹائپ میں۔ باتصویر اور بہترین مغربی ٹھاٹھ سے مَنصّۂ شہود پر آیا ہو۔ علوم والسنہ مشرقیہ کے شیدائی۔ ادب وانشا کی خوبیوں کے رسیا اور مسلمانوں میں حیاتِ ملّی کے احیا کے آرزومند پروانہ وار ٹوٹ ٹوٹ کر "الہلال" اور ابوالکلام پر گرے اور دو ہفتوں کے اندر ہی ان کا شہرہ ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچ گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے لکھنے پڑھنے کا ذوق شوق بخشنے اور جذبات کے اعتبار سے پرجوش مسلمان بنانے میں علامہ اقبال کی نظم اور ابوالکلام آزاد کی نثر نے سب سے بڑا حصّہ لیا ہے۔ میں ان دونوں کے

اثراتِ خامہ کا مطالعہ نہایت پابندی سے کرتا رہا۔ اور مولانا نے تو میرے نام "الہلال" اعزازی طور پر جاری کر رکھا تھا۔

۱۹۱۲ء میں مولانا لاہور آئے۔ موچی دروازے کے باہر باغ میں ہزارہا کا مجمع ہوا۔ جس میں مولانا نے ایک بے نظیر تقریر کی بے ریش و بروت سرخ وسفید چہرہ۔ بڑی بڑی سخن گو آنکھیں، حرکات وسکنات شیریں اور سنجیدہ۔ خطابت کے کمالات اور زبان و ادب کے محاسن ان سب نے مل کر مجمع کو مسحور کر رکھا تھا اور مولانا سے میری شیفتگی اور فریفتگی کی تو کوئی حد نہ تھی۔

رانچی میں خط و کتابت

چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی "اتحادِ عالمِ اسلامی" کی تحریک کے بڑے کارکنوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس لئے جنگِ عظیم اوّل میں جہاں محمد علی، شوکت علی، ظفر علی مقید و پابند کر دیئے گئے اور وہاں مولانا ابوالکلام بھی رانچی (بہار) میں نظر بند ہوئے۔ "البلاغ" جو "الہلال" کی بندش کے بعد نومبر ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا تھا مارچ ۱۹۱۶ء میں بند ہوگیا جو آفتاب رشد و ہدایت کلکتہ کے افق سے سارے ملک میں تجلیاں بکھیر رہا تھا۔ صرف رانچی کے مسلمانوں کے لئے وقف ہوگیا۔ جنہوں نے اس نعمت غیر مترقبہ سے بے حد استفادہ کیا۔

میں ان دنوں تہذیب نسواں اور پھول کا ایڈیٹر تھا۔ ایک خاتون نے "فسخ نکاح زوجہ معلقہ" کا مسئلہ تہذیب نسواں میں چھیڑا۔ اس پر ایک صاحب نے اخبار "وکیل" (امرتسر) میں تلخ سا مقالہ لکھ دیا۔ جس کا جواب میں نے "وکیل" ہی میں دیا۔ اس سے چند

روز بعد ایک دن دفعتہً مولانا ابوالکلام کا ایک خط میرے نام آیا۔ جس میں میرے مضمون کی تعریف کی تھی۔ اور مسئلے کے چند پہلو بھی واضح کئے تھے۔ میں نے اس خط کا جواب دیا تو مولانا نے لکھا کہ آپ کی استعداد سے زیادہ آپ کے حسن خط کا اثر مجھ پر ہوا۔ میرا خیال ہے کہ جس شخص کا خط اچھا ہو اس کی فطرت میں بھی کوئی نہ کوئی حسن پوشیدہ ہوتا ہے۔ آپ اپنے مزید حالات لکھیئے"۔ میں نے حالات لکھ دیئے۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ کوئی پچاس ہزار دستخطوں سے ایک محضر گورنر بنگال کو بھیجا گیا ہے جس میں میری رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ غالباً میں عنقریب رانچی کی نظر بندی سے رہا کر دیا جاؤں گا اور "الہلال" کے دوبارہ اجراء کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے آپ تیار رہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ چند سال رفاقت و یکجائی میں بسر ہو جائیں اور آپ الہلال میں کام کریں وجہ معاش کی فکر نہ کیجئے۔ جو کچھ آپ کو لاہور میں ملتا ہے وہ مع اس اضافہ کے جو کلکتہ کی گرانی مصارف کی بنا پر ضروری ہوگا۔ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائیگا۔

خط و کتابت جاری رہی اور میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ مجھے اس شخص نے رفاقتِ تحریر کے لئے منتخب کیا تھا۔ جس کو آغاز "الہلال" ہی سے میں نے انتہائی احترام اور مرعوبیت سے دیکھا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر چند سال مولانا کے ساتھ بسر ہو گئے اور میں نے ان سے قرآن حکیم سمجھ لیا تو دینی و دنیاوی برکات کا خزانہ سمٹ کر میرے قبضہ میں آجائے گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ گورنر نے محضر کو نامنظور کر دیا اور مولانا بدستور نظر بند رہے۔

مولانا لاہور میں

اس کے بعد مولانا اُس زمانے میں لاہور تشریف لائے۔ جب تحریکِ خلافت نرم پڑ چکی تھی۔ شُدھی۔ سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کا دَور تھا (۱۹۲۳ء) مولانا موٹر کار میں امرت سر سے لاہور پہنچے۔ مَیں بھی استقبال کرنے والوں میں شامل تھا۔ سالہا سال کے بعد مَیں نے مولانا کی زیارت کی۔ اب گلّوں پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی بہار دے رہی تھی میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء کے دولت کدہ پر قیام ہوا۔ وہیں مہر صاحب نے مولانا کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی تھی۔ ہر سیاسی عقیدے کے مسلمان اکابر جمع ہوئے جن سے مولانا نے مسلمانوں کی سیاست پر گفتگو کی۔ اور کانگریسی ہندو لیڈروں اور کارکنُوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ مقصُود یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو سیاسی ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہے۔ اسے فرقہ وار تحریکوں سے برباد نہ ہونے دیا جائے "الہلال" دوبارہ جاری ہوا (۱۹۲۷ء) نصف ٹائپ میں اور نصف لیتھو میں چھپتا تھا۔ اگرچہ اب اس کی افادی حیثیت بڑھ گئی تھی۔ لیکن چونکہ جوش و خروش کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس لئے جذبات انگیز انشا پردازی مفقود تھی۔ جس کی توقع نوجوانوں کو "الہلال" سے تھی

ٹرین میں ملاقات

جن دنوں ملک کے مختلف صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو رہی تھیں۔ مولانا ابوالکلام ترتیبِ وزارت کے لئے صوبہ سرحد تشریف لے جا رہے تھے۔ مہر صاحب لاہور ریلوے اسٹیشن پر ان سے ملے اور عرض کیا کہ آپ کی اور ہماری سیاست میں جو

بُعد ہے اس کا یہ نتیجہ تو نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم آپس میں مل بھی نہ سکیں۔ آپ اپنی مصروفیت ہی میں آتے اور غالباً اسی مصروفیت کے عالم میں واپس چلے جاتیں گے پھر ہم جیسے نیاز مندوں کو استفادے کا موقع ملے تو کیونکر۔ مولانا نے وعدہ فرمایا۔ پشاور سے واپس روانہ ہوتے وقت آپ ہی کو تار دوں گا اور کسی کو میرے آنے کی اطلاع نہ ہوگی۔ آپ ریلوے سٹیشن پر آجاتیے۔ چونکہ یہاں کی ٹرین کے لاہور پہنچنے اور دہلی جانے والی ٹرین کے روانہ ہونے کے درمیان دو ڈھائی گھنٹے کا وقفہ ہے۔ اس لئے بوجہ احسن ملاقات ہوسکتی ہے۔

جب مولانا کا تار آیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ریلوے سٹیشن لاہور پر ممکن ہے بعض اور لوگ بھی مولانا سے ملنے آجاتیں اور ہمارا مزا کرکرا ہو۔ اس لئے گوجرانوالہ چلو۔ وہاں سے مولانا کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر آئیں گے۔ چنانچہ ہم گوجرانوالہ چلے گئے۔ اور جب مولانا کی ٹرین پہنچی تو ان کے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ حسبِ معمول تپاک اور شگفتہ روئی سے ملے۔ اور باتیں شروع ہوئیں۔ ہماری سیاست "جداگانی اور پاکستانی" مولانا سر سے پاؤں تک نیشلزم اور کانگریس میں مستغرق لہذا ہم مولانا سے کبھی سیاسی بات چیت نہ کرتے تھے۔ ہمیشہ قرآن، ادب اور تصانیف وغیرہ کے مسائل میں استفادہ کیا کرتے تھے، دو گھنٹے بہت دلچسپ اور مفید باتیں ہوتیں۔ لاہور سٹیشن پر کوئی کانگریسی موجود نہ تھا۔ لہذا وہاں بھی بات چیت اور بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی جاری رہی۔ اس کے بعد کچھ گاندھی ٹوپیاں نظر آگئیں جن کو کسی طریقے سے مولانا کی آمد کی اطلاع ہو گئی تھی۔ بہرحال ہم مولانا کو دہلی جانے والی ٹرین میں سوار کرا کے رخصت ہوئے۔

راشٹرپتی

اس کے بعد ایک دفعہ مولانا لاہور تشریف لائے اور میاں محمود علی صاحب بیرسٹرایٹ لا (خلف مولانا عبدالقادر قصوری) کے ہاں دعوت چائے پر ملاقات ہوئی۔ اسی دن مولانا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ یہاں بعض نوجوانوں نے اپنی عادت اور اپنے معمول کے مطابق مولانا پر سیاسی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مولانا اپنے ذوق کے مطابق سنجیدگی سے جواب دیتے رہے لیکن جب عامیانہ جرح و قدح ہونے لگی تو بہت بیزار ہوئے اور مولانا عبدالقادر نے اس ناگوار صحبت کو ختم کر دیا۔

میاں افتخارالدین کے ہاں

پھر ایک دفعہ میاں افتخارالدین کے ہاں مَیں اور مہر صاحب حاضر خدمت ہوئے۔ ان دنوں لاہور میں جمعیت العلما کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جس پر مَیں نے "ریشلاغ" کی پھبتی کہی تھی۔ مہر صاحب نے یہ پھبتی مولانا کے گوش گزار کی۔ انہوں نے بہت داد دی۔ اور کہا کہ لمبی لمبی جھالر نُما ڈاڑھیوں کے مجمع کو اس سے بہتر کیا نام دیا جا سکتا ہے، پھر مجھ سے پوچھا، کہئے سالک صاحب کیا مشغلے ہیں۔ مَیں نے عرض کیا وہی سیاست و صحافت کی خاک بازی۔ فرمایا۔ جی ہاں۔ کوئی نہ کوئی لگاؤ اور اٹکاؤ زندگی بسر کرنے کے لئے ضرور ہونا چاہیئے۔ مَیں نے کہا کہ یہ کانگریس کی صدارت وغیرہ بھی تو لگاؤ اور اٹکاؤ ہی ہے۔ فرمانے لگے اس میں کیا شبہ ہے زندگی بغیر کسی اٹکاؤ کے بسر ہو ہی نہیں سکتی۔ مہر صاحب چونکہ مولانا سے بعض علمی مسائل پر بطور خاص گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

اور تخلیہ کے طالب تھے۔ اس لئے مولانا نے ان سے کہا کہ آپ صبحِ کاذب کے وقت آ جیئے تو تخلیہ میسّر آسکتا ہے۔ چنانچہ مہر صاحب صبح ۲½ بجے مولانا سے ملتے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے قطعی تخلیہ مل جاتا تھا اور چینی چائے کا دور بھی چلتا تھا۔

لاہور میں آخری ملاقات

پھر مولانا سے اس وقت ملاقات ہوئی جب ۱۹۴۵ء میں لاہور آئے تھے۔ اور فلیٹی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس زمانے میں بہت کمزور تھے۔ اس ملاقات میں سیّد احمد شہید کے متعلق باتیں ہوئی تھیں۔

غالباً آخری دفعہ مولانا اس وقت لاہور آئے جب ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بعد وزارت مرتّب ہو رہی تھی اور لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی مفاہمت زیرِ غور تھی۔ مولانا آچاریہ اندرناتھ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے[1]۔ ہر وقت سینکڑوں کانگریسی ان کے درشن کے لئے جمع رہتے۔ آخر مَیں نے اور مہر صاحب نے کہلا بھیجا کہ ہم حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ وقت مقرّر ہو گیا۔ دوپہر کے وقت ہم باریاب ہوئے۔ مولانا نے مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے کہہ دیا کہ بس اب کمرے کا دروازہ بند کر دیجئے اور لوگوں

---

[1] فلیٹی ہوٹل میں مولانا اس وقت ٹھہرے تھے۔ جب ۱۹۴۵ء میں احمد نگر کی اسیری سے رہا ہونے کے بعد لاہور آئے تھے۔ ترتیب وزارت کا واقعہ ۱۹۴۶ء کا ہے۔ اس وقت مولانا نے راجہ نریندر ناتھ کی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔ وہاں بھی تخلیئے میں ملاقات ہوئی تھی۔ سالک نے دو الگ ملاقاتوں کو یکجا لکھ دیا۔ (مہر)

سے کہہ دیجئے کہ میں آج کسی سے نہیں ملوں گا۔ ہم حاضر خدمت ہوتے تو مولانا نے چائے کا سروسامان دُرست کیا۔ اور نہایت منّی بالطبع ہو کر باتیں شروع کیں۔ سالک صاحب آپ کو معلوم ہے۔ عربی میں کھٹائی کو کیا کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا حموض۔ کہنے لگے۔ کھٹا کرنا "تحمیض" کہلاتا ہے۔ برے معنی میں نہیں بلکہ چٹپٹا بنانے کے معنی میں۔ عربی میں ایک قول ہے حمّضوا مجالسکُم۔ اپنی مجلسوں اور صحبتوں کو چٹپٹا بناؤ۔ تو آپ کے آنے سے ہماری مجلس چٹ پٹی بن گئی۔ اس کے بعد ترجمان القرآن کی اشاعت۔ اس کے تیسرے حصّے کی ترتیب۔ سُورہ فاتحہ کی تفسیر کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

اس موقع پر بعض عقیدت مندوں نے فلیٹی میں ایک ٹی پارٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں ہر مذہب و ملّت اور ہر عقیدہ سیاسی کے کوئی آٹھ سو اشخاص شریک ہوتے مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ مولانا داؤد غزنوی۔ آغا شورش کاشمیری وغیرہ مولانا کیساتھ بیٹھے تھے۔ احباب کی گذارش پر مولانا نے ۴۵ منٹ تک تقریر کی۔ کمال یہ تھا کہ اس تقریر میں ہندو، مسلمان، کانگریس، لیگ، تحریک پاکستان، گاندھی جناح یا اور کسی شخصیت یا ادارے کا نام تک نہیں آیا لیکن مولانا کو جو کچھ کہنا تھا وہ سب کہہ گئے اور لُطف یہ ہے کہ کسی کو تقریر کے کسی فقرے سے ناگواری نہیں ہوئی۔ اعتراض کی گنجائش بھی نہیں نکلی بلکہ سب اس خطیبِ زمانہ کے حُسنِ بیان سے مسحور ہو رہے تھے۔

دہلی میں ملاقات

پاکستان قائم ہونے کے بعد مولانا ایک دو دفعہ کراچی سے ہو کر گذرے لیکن دو روزہ قیام کا بھی کبھی اتّفاق نہیں ہُوا۔ مہر صاحب دہلی جا کر ان سے مل آتے۔ اور

اپنی کتاب کے متعلق فراہمی مواد اور مشورت میں مستفیض ہوتے اب سے تین سال پہلے میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں دہلی گیا تو سب سے پہلے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دوپہر کے دو بجے تھے۔ جب میں مولوی اجمل خاں صاحب کے ساتھ حکومت ہند کے وزیر تعلیم کی شاندار کوٹھی کے پُر بہار کمرے طے کرتا ہوا اس گوشے میں پہنچا جہاں مولانا بیٹھے تھے تو دیکھا کہ کچھ مکھن لگے توس پلیٹ میں رکھے ہیں اور چائے کا سامان بھی موجود ہے۔ علیک سلیک اور بغلگیری کے بعد مَیں نے پوچھا۔ یہ بریک فاسٹ ہے یا لنچ؟ سامان کے لحاظ سے ناشتا معلوم ہوتا ہے اور وقت کے اعتبار سے کھانا آخر یہ کیا ہے بہت شگفتہ ہوتے کہنے لگے "غریب کو جب وقت ملے"۔ مَیں نے کہا۔ مجھے تو یہ اُمیر کو جب وقت بھوک لگے" کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی ہلکی ہلکی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔ ترجمان القرآن کے متعلق بتایا کہ بمبئی کے ایک مطبع سے فیصلہ ہو گیا ہے وہ چھاپے گا اور تیسری جلد بھی مرتب ہو گئی ہے وہ بھی اُسی کے حوالے کی جائے گی۔ پھر خواجہ ناظم الدین اور خواجہ شہاب الدین کی صحت کے متعلق دریافت کرتے رہے اور کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد مَیں نے اجازت چاہی۔

جب مَیں دوسری دفعہ دہلی گیا تو اس وقت مولانا ایک حادثہ کی وجہ سے فراشِ بسترِ علالت تھے۔ مَیں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے حالات دریافت کئے۔ ایسی حالت میں مولانا کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور مجبوراً بے دیکھے واپس آگیا۔

وضعداری اور لطافتِ طبع

مولانا کی پابندیِ وضع اور متانت ملک بھر میں مسلّم ہے۔ غذا و لباس نشست برخاست

تعلقات و روابط۔ اندازِ اظہار کی شائستگی۔ سخن طرازی و بذلہ سنجی جو پہلے دن تھی وہی اب تک قائم ہے اور اس اعتبار سے وہ برِ صغیر پاک و ہند میں غالباً کوئی مثال نہیں رکھتے۔ صاف ستھری۔ لطیف اور قلیل غذا کھاتے ہیں گوشت ہو یا سبزی یا دال۔ جب تک صفائی اور لطافت محفوظ ہے مولانا کو ہر شے پسند ہے۔ اور اگر غذا کے کسی جزو میں بھاری پن یا تکلف نظر آتے تو مولانا اس کو ہاتھ تک نہ لگائیں گے اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے چند نوالے کھا کر دسترخوان سے اٹھ جائیں گے۔ میٹھا پسند نہیں۔ نمک پسند ہے۔ اعلیٰ درجے کی چینی چاتے پیتے ہیں جس میں دودھ ڈالنا گناہِ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے۔

نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمانوں نے اپنے آباؤ اجداد کے وضع لباس کو چھوڑ کر کھدر کی گاندھی ٹوپیاں اور دھوتیاں اور چادریں اوڑھنا اختیار کر لیا۔ لیکن مولانا کا لباس وہی رہا جو روزِ اول سے چلا آ رہا ہے۔ پوست قراقلی کی اونچی دیوار والی ٹوپی۔ اچکن اور قمیص پاجامہ۔ علی برادران نے بھی کانگریسی وضع اختیار نہیں کی۔ لیکن آخر میں لمبے چغے اور بھیلے اور سمادہ و عقال سے عرب وضع میں ڈھلنے کی کوشش ضرور کی۔ مولانا ابوالکلام نے اپنی وضع کو اب تک قائم رکھا ہے۔ عربی تو خیر ان کی مادری زبان ہے۔ فارسی اور اردو میں ان کی مہارت مسلم ہے۔ انگریزی بھی جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے انہیں ہمیشہ انگریزی کی کتابیں اور انگریزی کے اخبارات کا مطالعہ کرتے دیکھا۔ لیکن انگریزی بولنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ انہوں نے انگریزی محض پرائیویٹ کوشش سے سیکھی ہے اور انہیں احساس ہے کہ انگریزی میں ان کا تلفظ صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے اس زبان کی تحصیل میں کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔

لطائف کا ذوق

مولانا اپنے بے تکلف احباب میں بیٹھتے ہیں تو لطیفہ کہنے اور لطیفہ سُننے کے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں اور لُطف یہ ہے کہ کسی حالت میں اور کسی موقع پر بھی ان کی زبان "پست و مُبتذل" سے ہرگز آلودہ نہیں ہوتی اور لطافت کو جو ان کی پوری شخصیت اور ان کے مکمل کردار پر حاوی ہے ذرا بھی صدمہ نہیں پہنچتا۔ ایک دن نینی جیل الہ آباد کی اسیری کے حالات سنا رہے تھے۔ کہنے لگے میری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک کوٹھڑی میں کوئی چینی قیدی رہتا تھا۔ افسوس ہے بیگانگیٔ زبان کی وجہ سے ہم آپس میں بات چیت نہ کر سکتے تھے اور صرف ایک دوسرے کا مُنہ ہی تک کر رہ جاتے تھے۔

زبان یار من چینی و من چینی نمی دانم

اس چینی کو یہ معلوم نہ تھا کہ مَیں کس جُرم میں ماخوذ ہوں۔ غالباً سوچتا رہتا ہوگا۔ آخر اس دن اس سے نہ رہا گیا۔ مجھے مخاطب کر کے میرے سامنے ہاتھ لہرانے لگا۔ یعنی یہاں کیسے آئے؟ مَیں کیا جواب دیتا۔ جب خاموش رہا تو اس نے پوچھا۔ "اوپیم" یعنی افیم کے معاملے میں پکڑے گئے ہو؟ مَیں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تو اس نے اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر چھُری کی طرح پھیرا۔ یعنی پوچھا۔ کسی کو قتل کیا ہے؟ میں نے پھر سر ہلایا۔ آخر اس نے پوچھا "گاندھی"؟ مَیں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بالکل مطمئن ہو گیا۔ گویا گاندھی بھی ناجائز افیم اور قتل کی طرح جرائم میں شامل ہے۔

ایک علمی حقیقت

کوئی علمی بات بھی کریں گے تو اس کو اپنی خوش بیانی سے اتنا دلکش بنا دیں گے کہ عمر بھر بھلائی نہ جا سکے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ایک دن سیّد احمد شاہ بخاری کے ہاں کھانے پر آتے۔ مسلمانوں میں روحِ عمل کے فقدان پر بات ہو رہی تھی۔ فرمایا تصوّف کی کتابیں اور اولیا کے تذکرے پڑھو تو اس قسم کے واقعات اکثر نظر آئیں گے کہ ایک بزرگ محفل سماع میں بیٹھے تھے۔ مطرب نے شعر پڑھا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

حضرت نے سن کر نعرہ مارا اور بیہوش ہو گئے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بازار میں جا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ایک امرود فروش کی ٹوکری میں صرف ایک امرود باقی رہ گیا تھا اور وہ اس کو اٹھا کر صدا لگا رہا تھا۔ "لم یبقیٰ الا الواحد" "لم یبقیٰ الا الوٰحد" حضرت بسطامی نے نعرہ مارا اور بیہوش ہو گئے۔ حضرت فلاں رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رنڈی کو تائب ہونے کی تلقین کی۔ اس نے شعر پڑھا ؎

در کوئے نیکنامی ما را اگزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

حضرت نے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔

پھر مولانا نے فرمایا۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ مسلمان نعرہ مارتا تھا تو دشمن بیہوش ہو جاتے تھے۔ پھر ایسا زمانہ آیا کہ مسلمان خود ہی نعرہ مارتا تھا۔ اور خود ہی بیہوش ہو جاتا تھا۔

پنجابی کے اشعار

چونکہ مولانا کو کچھ مدت پنجاب میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی پنجابی کے لطیفے اور بعض مصرعے پڑھ پڑھ کر ہم نشینوں کو ہنساتے ہیں اور بڑی بڑی لغو چیزیں یاد ہیں۔ ایک دن بیان کر رہے تھے کہ جن دنوں میں "وکیل" میں تھا۔ میرے والد محترم نے لکھا کہ پنجاب میں جنتریاں اچھی اچھی شائع ہوتی ہیں بازار سے جتنی جنتریاں مل سکیں وہ سب بھیج دو۔ میں نے ہال بازار میں گھوم پھر کر گردھاری لال کی مشہور عالم جنتری پنڈت دیوی دیال جفار کی جنتری۔ ایک دو مسلمانوں کی چھاپی ہوئی جنتریاں اکٹھی کیں۔ رات کو انہیں پڑھنے بیٹھا۔ تو ایک جنتری میں حکیم ڈاکٹر فیروز الدین، ہال بازار امرتسر کی حذاقت کے متعلق اشتہار نظر آیا۔ جس کے درمیان میں ایک پنجابی کی نظم بھی بطور سند حکمت و حذاقت درج تھی۔ شاعر کا نام مجھے یاد نہیں رہا اور نظم کا بھی صرف ایک ہی مصرع یاد رہ گیا۔ یہ کہہ کر مولانا نے اپنے اردو لہجے میں یہ مصرع پڑھ کر ہمیں بے حد ہنسایا۔ ؎

تپ تلی دی بیماری ہوئی سخت جو بھاری پنڈوں کیتی میں تیاری شہر انبر سر نوں[1]

ہنستے ہنستے مجھ سے سوال کیا۔ سالک صاحب آپ تو پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا یہ کس شاعر شیریں سخن کا کلام بلاغت نظام ہے۔

میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ نے تو ایک خاصے شاعر کو مضحکہ کا نشانہ بنا لیا۔ یہ

---

[1] یعنی بخار اور تلی کی بیماری ہوئی تلی بڑھ گئی تو میں نے گاؤں سے شہر امرتسر کی تیاری کی تاکہ حکیم ڈاکٹر فیروز الدین سے علاج کراؤں۔

یہ اشعار مولوی میاں جان مشہور پنجابی واعظ کے ہیں۔ مولوی صاحب شاعر تھے۔ اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عمر بھر اسی "بحر طویل" میں اشعار لکھے کسی دوسری بحر کا تجربہ نہیں کیا۔ "تفسیر معوذتین" مولوی میاں جان نے منظوم لکھی ہے وہ بھی اسی بحر میں ہے۔ مولوی میاں جان نومسلم تھے۔ چنانچہ ان کا ایک مصرع اس کا شاہد ہے ع

سن میاں جان تیرا پیو بے ایمان تینوں رب دتا ایمان تیرا جنت مقام ہے[1]

اس پر مولانا بے حد محظوظ ہوتے اور کہنے لگے۔ آپ مولوی صاحب کے متعلق علمی وتاریخی تحقیق کرتے رہیے۔ ہمیں تو ان کے اس ارشاد کی بے ساختگی مزا دے گئی کہ

سن میاں جان تیرا پیو بے ایمان

پھر میں نے کہا۔ مولانا میاں جان کی جس نظم کا ایک مصرع آپ نے پڑھا وہ نظم میں نے بھی اسی زمانے میں پڑھی تھی۔ جب میری عمر کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی۔ آپ کو اس کا صرف ایک مصرع یاد رہا۔ مجھے چار مصرعے یاد ہیں، کہنے لگے۔ ہاں ہاں ہم بھی وہ مصرعے سنیں گے۔ مَیں نے سنا دیئے ؎

نپ تلی دی بیماری ہوئی سخت جو بھاری پنڈوں کیتی میں تیاری شہرانبر سرنوں
پھر ان پچھیا حکیماں دوا دتو سکیناں۔ میرے پاس نہ خزینہ دوا دیلے نے زرنوں
کسے آکھیا پکار پچھ حال جا بازار۔ نامور ہشیار جو تحبار ڈر در نوں
سن میاں جان جو فیروز الدین نام کتھے ایسا انسان جو نشان پچھاں ہرنوں

---

[1] میاں جان تیرا باپ ایمان سے محروم رہا۔ تجھے خدا نے ایمان عطا کیا اور تیرا مقام جنت میں ہے۔

مولانا بے حد محظوظ ہوتے اور بیچ بیچ میں کچھ چٹکلے بھی چھوڑتے رہے۔ اس کے بعد فرمانے لگے۔ سالک صاحب ہم سمجھتے تھے۔ ہمیں بہت سی بیہودہ چیزیں یاد ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے آپ کو ہم سے زیادہ یاد ہیں۔

مولانا کے لطائف بے شمار ہیں۔ لیکن کہاں تک بیان کئے جائیں۔ ان کا وجود اس برصغیر میں غنیمت ہے کیونکہ ایسی جامع حیثیات ہستیاں کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتی ہیں

سیّد ممتاز علی

شمس العلما، مولوی سیّد ممتاز علی ادب و انشا میں میری تربیت کے واحد ذمہ دار ہیں۔ ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہونے سے قبل میں نے بعض مضامین بھی لکھے تھے اور پٹھانکوٹ سے ایک ادبی رسالہ "فانوس خیال" بھی جاری کیا تھا ــــــ لیکن میرے باقاعدہ شغلِ تحریر نے مولوی صاحب ہی کے آغوشِ عاطفت میں پرورش پائی۔ مولوی صاحب عربی فارسی اور اُردو میں پوری دسترس رکھنے کے علاوہ انگریزی بھی خُوب جانتے تھے اور طبیعت میں تحقیق، تنقید اور تجسّس کا مادہ بہت زیادہ تھا۔

حضرت امام رضاؑ کے اولاد و احفاد میں سے ایک خاندان غالباً عہدِ عالمگیری میں

بُخارا سے ہندوستان میں وارد ہوا۔ اور جگادھری ضلع انبالہ کے قریب آباد ہو گیا۔ دو تین نسلیں وہیں مقیم رہیں۔ آخر ایک بزرگ میر ہاشم علی دیوبند میں جاکر آباد ہو گئے۔ ان کے بھانجے میر ستّار علی نواب بہادر گڑھ کے مدار المہام مقرر ہوئے۔ میر ستّار علی کے صاحبزادے سیّد ذوالفقار علی ادب فارسی میں مولوی امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ اور عربی دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج سے پڑھی تھی۔ شملہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس۔ ضلع گجرات میں سررشتہ دار اور راولپنڈی میں تحصیل دار رہنے کے بعد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہو گئے اور پنجاب کے متعدد اضلاع میں مقیم رہے۔ سیّد مُمتاز علی ۱۸۶۲ء میں انہی سیّد ذُوالفقار علی کے ہاں پیدا ہوئے۔ مقامِ ولادت راولپنڈی ہے۔ اُردو عربی کی تعلیم دیوبند میں گھر ہی پر حاصل کی۔ فیروزپور۔ سرسہ اور لاہور میں انگریزی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوئے اور پنجاب چیف کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔

تصنیف و تالیف اور مطالعہ کا شوق بے حد تھا۔ اس لئے سرکاری ملازمت چھوڑ کر رفاہِ عام پریس کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کر دیا۔ نوجوانی کے زمانے میں اسلام کے متعلق شُبہات پیدا ہوئے جو انہوں نے سرسیّد کو لکھ بھیجے سرسیّد نے ان کو اپنے پاس بُلایا اور چند روز کی گفتگو میں وہ تمام شُبہات دُور کر دیئے۔

توازن و اعتدال

مولوی صاحب علمِ دین سے بھی بہرہ ور تھے اور دیوبند ان کا وطن ہی نہ تھا بلکہ اکابرِ دیوبند سے فیضیاب بھی تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے تعلّقات مخلصانہ رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ہی سرسیّد محسن الملک وقار الملک حالی شبلی نذیر احمد سے

بھی بے تکلفانہ رسم و راہ تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد کو ادب و انشا میں اپنا اُستاد مانتے تھے۔ ان تمام گوناگوں اثرات کی وجہ سے ان کے ذہن میں بے نظیر توازن و اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جس وقت انہوں نے مسلمان عورتوں کی تعلیم و تہذیب کا بیڑا اُٹھایا تو ان کی مساعی میں اس بے اعتدالی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا جو عام طور پر زمانۂ حاضر کے حامیانِ نسواں کے اقوال و اعمال میں پیدا ہو جایا کرتی ہے بلکہ وہ مسلمان عورت کو سب سے پہلے مسلمان دیکھنا چاہتے تھے اور اساسی اعتبار سے اس کا دائرہ عمل اندرونِ خانہ کی سرگرمیوں یعنی خانہ داری۔ تربیتِ اولاد اور تہذیبِ اطوار ہی تک محدود سمجھتے تھے۔

حُرّیتِ نسواں

مَیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں مولوی صاحب کے دو ہفتہ وار اخباروں یعنی تہذیبِ نسواں اور پھول کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ اور اسی دن سے میری مطمئن ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادے سید حمید علی اور سید امتیاز علی مجھ سے بھائیوں کا سا برتاؤ کرتے تھے اور مولوی صاحب بھی بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ وہ میری نظم و نثر اور زبان و بیان میں میری اصلاحی صلاحیت کو دیکھ چکے تھے۔ اس لئے میری تربیت پر خاص توجہ صرف کرتے تھے۔

مسائلِ نسواں میں مولوی صاحب کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ وہ بیواؤں کے نکاحِ ثانی اور پردے کے متعلق رضامندی کو شرط قرار دیتے تھے۔ اگر بیوہ رضامند ہو تو اس کا نکاحِ ثانی کیا جائے ورنہ نہیں۔ اگر کوئی عورت پردہ نہ اٹھانا چاہے تو وہ مختار ہے۔

اور اگر ترک کرنا چاہے جب بھی اسے روکنا درست نہیں۔ ایک دفعہ میں نے کسی مضمون میں "آزادیٔ نسواں" کی ترکیب لکھ دی تو کہا ——— میاں سالک۔ آزادیٔ نسواں ——— کی جگہ حُرّیتِ نسواں لکھا کرو۔ "حُرّیت" ایک دینی اصطلاح ہے جس کا مقصود ہے بعض بُنیادی حقوق۔ جو دین نے عورت کو دیتے ہیں۔ آزادی کا لفظ غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔

سرسیّد اور حقُوقِ نسواں

مولوی صاحب نے لڑکیوں کے لئے "تہذیبِ نسواں" جاری کیا اور اپنی بعض عزیزات سے اس میں مضامین لکھواتے تو اس تاریکی اور جہالت کے زمانے میں ہر طرف شور مچ گیا اور مولوی صاحب کے نام گالیوں سے بھرے ہوتے خطوط آنے لگے۔ اس وقت بڑے بڑے مُدّعیانِ روشن خیالی بھی عورتوں میں تعلیم و تہذیب پھیلانے کی تحریک کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے تا بہ عوام کالانعام چہ رسد۔ یہاں تک کہ جب مولوی صاحب نے اپنی مشہور کتاب "حقُوقِ نسواں" لکھی تو اس کا مسودہ لے کر سرسیّد کی خدمت میں حاضر ہوتے تاکہ ذرا ان کو بھی دکھالیں۔ سرسیّد اس مسوّدے کو جستہ جستہ مقامات سے دیکھنے لگے۔ لیکن مولوی صاحب نے دیکھا کہ غصّے سے سرسیّد کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا ہے۔ آخر سرسیّد نے اس مسوّدے کو چاک کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور کہا۔ ممتاز علی۔ ہماری حکُومت چھن گئی۔ ہماری تہذیب مٹ گئی۔ اب کیا ہماری عورتیں بھی ہمارے قبضے سے نکل جائیں گی؟ مولوی صاحب نے بہتیرا کہا کہ مَیں نے اس کتاب کی تحریر میں شریعتِ مُقدسہ کے حدُود سے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا

لیکن سرسید کا مزاج رُو بہ راہ نہ ہُوا اور مولوی صاحب ناچار اپنے مسودّے کے ٹکڑے ردّی کی ٹوکری میں سے اٹھا کر چلے آتے۔ آج اس کتاب کو پڑھتے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس میں وہ کونسی بات تھی جس نے سرسیّد جیسے روشن خیال اور تجدُّد پسند شخص کو بھی چراغ پا کر دیا۔

حقیقت میں ان دونوں بزرگوں کے نقطہ نگاہ میں فرق تھا۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ پہلے مسلمان لڑکوں کو جدید تعلیم سے بہرہ ور کیا جاتے۔ اس کے بعد وہ جس حد تک مُناسب سمجھیں گے۔ اپنی عورتوں کو بھی پڑھا لکھا لیں گے لیکن مولوی ممتاز علی کہتے تھے کہ ماں چونکہ بچے کی تعلیم و تربیت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اس لئے لڑکیوں کو بہترین تعلیم دینی چاہیئے تاکہ آئندہ نسل ان کی گود میں پل کر تعلیم و تہذیب سے بہرہ اندوز ہو سکے۔

اکبر الہ آبادی

اس موقع پر اکبر الہ آبادی کا ایک لطیفہ یاد آگیا جو اپنے دَور میں جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کے خلاف نکتہ چینی میں بے حد سرگرم تھے۔ آپ نے دو شعر لکھے جن میں روئے سخن سرسید اور سیّد ممتاز علی کی طرف تھا ؎

اک پیر نے تعلیم سے لڑکے کو اُبھارا — اک پیر نے تہذیب سے لڑکی کو سنوارا
پتلوُن میں یہ اکڑا تو وہ ساتے میں پھیلی — پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اُتارا

اس پر مولوی صاحب نے اکبر الہ آبادی سے شکایت کی تو انہوں نے خط میں لکھا۔ کہ

> مَیں ترقی و تہذیب نسواں کا ہرگز مخالف نہیں ہوں جن نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ پرانی نظمیں ہیں جن میں پبلک کے خیالات موزوں کر دیئے گئے ہیں۔ مَیں کیا اور میرے اشعار کیا۔ شعرا۔ قافیہ پیمائی کیا ہی کرتے ہیں۔ دنیا کے قوانین شعر سے نہیں چلتے۔ زمانے کا رنگ زمانے کی ضرورتیں فیصلہ کرتی ہیں اور اس وقت بھی کر رہی ہیں۔

یہ معذرت بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ جس کے ایک ایک لفظ میں طنز کے نشتر چھپے ہوتے ہیں۔

تعلیمی و اصلاحی ادب

مولوی صاحب نے حمایتِ نسواں کے جرم میں ابتداً لوگوں کی گالیاں کھائیں، لعنت ملامت اٹھائی لیکن اپنی پوری زندگی اس مظلوم طبقے کی حمایت میں بسر کر دی جسے اسلام نے پورے حقوق عطا کئے تھے۔ لیکن مسلمانان ہند نے غلامی و کس مُپرسی کے گڑھے میں گرا رکھا تھا۔ مولوی صاحب نہایت روشن دماغ ماہرِ تعلیم بھی تھے چُنانچہ سالہا سال تک مُسلم یونیورسٹی کورٹ اور پنجاب یونیورسٹی سینٹ کے ممبر رہے اور ہمیشہ اپنے مُفید مشوروں سے شعبۂ تعلیمات کی رہنمائی کرتے رہے۔

مولوی صاحب کی اہلیہ محترمہ مُحمدی بیگم پڑھی لکھی۔ شائستہ ذوق اور دردمند خاتون تھیں۔ انہوں نے لڑکیوں اور عورتوں کے لئے متعدد پاکیزہ کتابیں شائع کیں جو گزشتہ پچاس سال سے قدردانی کے ساتھ پڑھی جا رہی ہیں۔ مولوی صاحب کی نگرانی میں دارالاشاعت

پنجاب نے عورتوں اور بچوں کے لئے معیاری لٹریچر شائع کیا ہے اور ان کتابوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

شگفتگیٔ طبع

مولوی صاحب اپنے علم و فضل اور انہماکِ خدمت کے باوجود بے حد شگفتہ مزاج اور ظریف بزرگ تھے۔ اور مجھے اور امتیاز کو اکثر لطائف سنا کر ہنسایا کرتے تھے۔ ایک دن ارکانِ صلوٰۃ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی کہنے لگے۔ صلوٰۃ یعنی نماز تو ہر حال میں فرض ہے۔ باقی رہے ارکان۔ تو وہ بعض خاص ضرورتوں اور مجبوریوں کی حالت میں ساقط بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جو شخص کھڑا ہو کر نماز نہ پڑھ سکے وہ بیٹھ کر پڑھ لے۔ اور جو بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے وہ لیٹ کر۔ بلکہ بعض حالات میں اشاروں ہی سے پڑھ لے۔ پھر کہنے لگے ایک دفعہ میں ٹرین میں لاہور سے دیوبند جا رہا تھا۔ ایک ہم سفر کو دیکھا کہ اس نے نماز کے لئے اپنے پاس بیٹھنے والوں کو جگہ خالی کرنے کی تکلیف دیئے بغیر ٹرین کے بینچ ہی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ باندھ لئے اور اشارے سے رکوع و سجود کر کے نماز ادا کر لی۔ میں دیوبند پہنچا تو مولانا محمود الحسن سے اس واقعے کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "مولوی صاحب اس شخص کی نماز نہیں ہوئی"۔ مَیں نے برجستہ کہا "حضرت ہمارے سامنے تو ہو گئی تھی"۔ اس پر مولانا محمود الحسن بے اختیار ہنس دیئے۔

ایک دفعہ کسی نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ بعض بزرگوں کی نسبت کے باعث بعض شہروں کے نام "شریف" رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً اجمیر شریف، پاکپتن شریف۔ آیا شریعت میں یہ جائز ہے؟ فرمانے لگے۔ اگر "مزاج شریف" جائز ہے تو اجمیر شریف میں کیا مضائقہ ہے

مجھے "تہذیب نسواں" اور "پھول" کا کام سنبھالے ہوتے ابھی چند ہی ماہ ہوتے تھے کہ مولوی صاحب کی صاحبزادی وحیدہ بیگم (مرحومہ) جو مولوی سر محمد یعقوب مرادآبادی کی اہلیہ تھیں۔ مرادآباد میں سخت بیمار ہو گئیں۔ مولوی صاحب کوئی سات مہینے مرادآباد میں رہے۔ ان کی غیر حاضری میں مَیں ان کی نگرانی و ہدایت کے بغیر ان کے دونوں ہفتہ وار پرچوں کو مرتّب کرتا رہا۔ واپس آ کر مولوی صاحب نے صرف ایک دو جُزوی باتوں کی طرف اشارہ کیا۔ جن میں مجھ سے اس لئے لغزش ہوتی تھی کہ مولوی صاحب کی پالیسی ان معاملات میں بڑے رکھ رکھاؤ کی متقاضی تھی ورنہ مجموعی حیثیت سے انہوں نے میرے کام کو سراہا اور مجھ پر پُورے اعتماد کا اظہار کیا۔

ارتقا پر مضامین

ایک دفعہ سیّد امتیاز علی تاج نے اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کے لئے رسالہ "کہکشاں" جاری کیا۔ جس میں ہم سب دوست احباب لکھا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے مولوی صاحب سے گزارش کی کہ آپ "مسئلہ ارتقا" پر چند مضامین لکھ دیجئے جن کو پڑھ کر اُردو دان طبقہ ڈاروِن کی تھیوری کو پوری طرح سمجھ لے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے ارتقا اصل انواع اور جہد للحیات وغیرہ کے عنوانوں سے تین چار مضامین کہکشاں کے لئے لکھے۔

جو لوگ فکرِ جدید کی کتابوں کا ترجمہ کرتے ہیں یا آج کل کے علمی نظریات پر مضامین یا کتابیں لکھتے ہیں ان کو چاہیئے کہ مولوی صاحب کے ان مضامین کو غور سے پڑھیں جن میں مشکل سے مشکل مطالب کو ایسی سادہ زبان اور سلیس انداز بیان میں پیش کیا گیا ہے کہ محض اردو جاننے والے قارئین کو مسئلے کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ مولوی صاحب

ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ "جو بولو وہی لکھو"۔ ان کا یہ بھی ارشاد تھا کہ علم سمجھ لینے اور سمجھا دینے کا نام ہے،" جو شخص خود نہیں سمجھتا وہ دوسروں کو کیا سمجھاتے گا اور جو خود تو سمجھتا ہے لیکن دوسرے کو سمجھانے سے قاصر ہے اس کا علم بھی کسی کام کا نہیں۔

مولوی صاحب کے بڑے صاحبزادے سید حمید علی لڑکپن ہی میں بیمار ہو گئے تھے ان کے کُولھے کی ہڈی میں دق کا مادّہ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت علاج کئے گئے۔ لیکن سات سال گزر گئے آخر اس مرض کا تو ازالہ ہو گیا لیکن ٹانگ دوسری سے کسی قدر چھوٹی ہو گئی۔ حمید علی کی اس طویل علالت کے دوران میں مولوی صاحب اکثر ان کے بستر کے پاس بیٹھے ہوتے قُرآن پڑھتے رہتے تھے۔ ان دنوں یہ خیال آیا کہ قرآن مجید میں مختلف مطالب کی آیات تلاش کرنے میں ہر شخص کو دقّت ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کا ایک انڈکس تیّار کرنا چاہیئے۔ یہ خیال آتے ہی مولوی صاحب نے مطالب آیات کی ایک جامع مانع فہرست تیّار کی اور اس کے بعد قینچی لے کر آیات کو کتر کتر کر بڑے بڑے کاغذی تختوں پر چپکاتے گئے۔ کئی سال کی محنت کے بعد پورے قرآن کا انڈکس مکمّل ہو گیا۔ مدت تک یہ کتاب مسوّدہ کی صورت میں رہی اور اکثر اکابر علم جو باہر سے لاہور آتے تھے۔ اس مسوّدے سے استفادہ کرتے تھے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ مولانا حکیم نورالدین جب کبھی ضرورت محسوس کرتے۔ مولوی صاحب کے پاس آ کر اس فہرست مضامین سے فائدہ اٹھاتے۔

اب یہ بے نظیر کتاب تفصیل البیان (مطالب آیات القرآن) کے نام سے چھپ چکی ہے اور اس کی طباعت پر ہزاروں روپیہ خرچ ہُوا ہے اگر آپ چاہیں کہ شرع۔ اخلاق اصوُلِ دین۔ غرض کسی مسئلے کے متعلق قُرآن مجید کی تمام آیات یکجا مل جائیں تو "تفصیل البیان"

سے چند منٹ کے اندر یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور پھر لُطف یہ ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک تمام آیات کا بامحاورہ اُردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔

ایک دفعہ حضرت سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اور علوبہ پاشا لاہور آئے۔ مولوی سید ممتاز علی نے ان کو چائے کی دعوت دی اور تفصیلُ البیان دکھائی۔ مفتی اعظم نے اس کتاب کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ ایسی کتاب عرب دنیا میں بھی موجود نہیں۔ نجومُ القرآن فتح الرّحمان وغیرہ موجود ہیں۔ جن کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ ایک لفظ بھی یاد ہو تو آیت کا اتا پتا مل جاتا ہے۔ لیکن مسائل کی فہرست اور پھر ہر مسئلے کے متعلق تمام آیات کی یکجائی یہ خوبی عربی زبان کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ اس کتاب کو عربی میں بھی چھاپنا چاہیئے۔

اگر مولوی سید ممتاز علی اپنی پوری زندگی "تہذیبِ نسواں" میں صرف نہ کر دیتے تو ان کی قوّتِ تحریر بیسیوں کتابیں تصنیف کر ڈالتی۔ لیکن اس مصروفیت کے باوجود انھوں نے زاد المعاد۔ المنقذ من الضلال۔ شیخ حسن کے ترجمے کئے۔ تذکرۃ الانبیا لکھی۔ اور متعدّد چھوٹی چھوٹی کتابیں تالیف کیں لیکن تفصیل البیان ان کا وہ عظیم کارنامہ ہے۔ جس سے ان کا نام رہتی دنیا تک روشن رہے گا۔

مولوی صاحب نہایت نیک دل۔ متین، بلند اخلاق اور دردمند بزرگ تھے۔ ان کی ساری زندگی تعمیری و اصلاحی ادب کے فروغ اور مسلمانوں کی اصلاحِ معاشرت میں صرف ہوئی۔ ان کی خدمات سرسید کے حلقۂ رجال کے کسی بزرگ کے کارناموں سے کم نہیں رہیں۔

مولانا ظفر علی خان

مولانا ظفر علی خاں

ہمارے ملک میں جنگجویانہ صحافت وخطابت کے میدان کا یکّہ تاز۔ اُردو نظم ونثر یکساں بے تکلفی اور خاص طرز واسلوب سے لکھنے والا۔ بے شمار تحریکوں کا روح وروان۔ عوام کے قلوب میں حُریتِ وطن اور حمیتِ اسلامی کی روح پھونکنے والا۔ سالہا سال کی قید کو ہنسی خوشی جھیلنے والا۔ اور اردو اخبار نویسی کو قعرِ مذلّت سے اٹھاکر سربلند کرنے والا۔ کون؟ ظفر علیخاں جس کے نام اور کام سے پورا ہندوستان نصف صدی تک معمور رہا۔ اور جو آج ضعفِ پیری اور مسلسل علالت کے باعث زبان وقلم سے رشتہ توڑ کر بالش وبستر سے رابطہ استوار کرچکا ہے۔

زمیندار کا آغاز

مولوی سراج الدین احمد مرحوم کے انتقال کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے حیدر آباد دکن کی ملازمت ترک کر دی۔ "دکن ریویو" کو بند کر دیا۔ اور پنجاب چلے آتے تاکہ زیادہ وسیع میدانوں میں گُستہ مہار ہو کر مسلمانوں کی خدمت کریں۔ "زمیندار" پنجاب کے زراعتی طبقے کا ترجمان تھا۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں اس کو پوری ملّت کی زبان بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس ہفتہ وار اخبار کو کرم آباد سے لاہور لے آتے اور اس کو روزنامہ کی صورت دے کر ادب و انشا کے محاسن کا گلدستہ بنا دیا۔ یہ اخبار بینوں کے لئے ایک نادر نعمت تھی۔ وہ پیسہ اخبار اور وطن کی سادہ، متین اور "ٹھنڈی صحافت" پر اکتفا کر رہے تھے۔ "زمیندار" نے ان کے سامنے رنگا رنگ نعمتوں کا ایک خوان چن دیا۔ اور اپنی پُرزور خطابت سے اخبار کو تقویت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا ٹوٹ پڑی اور ہر طرف زمیندار اور اس کے مدیر کے کمالات کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ طرابلس و بلقان کی لڑائیوں نے اس آگ پر جو ظفر علی خاں کے دل میں روشن تھی تیل کا کام دیا۔ اور تحریک اتّحادِ اسلامی کے ایک کارکن کی حیثیت سے انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے اقتدار کو چیلنج دے کر مسلمانوں کے دلوں میں حسیاتِ اسلامی کی زبردست لہر دوڑا دی۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور اس لہر نے ایک قلزم ناپیدا کنار کی شکل اختیار کر لی۔

مشروط آزادی

مولانا ظفر علی خان نظر بند کر دیتے گئے۔ اس نظر بندی کے دوران میں ان کو دلوانے

کُتّے نے کاٹا۔ وہ بغرضِ علاج حکومت کی اجازت سے کسولی گئے اور شملہ پہنچ کر اپنے لئے مشروط آزادی کا پروانہ لے آئے۔ زمیندار تو سرمائیکل اوڈوائر کی مہربانی سے بند ہو چکا تھا۔ لیکن رام گلی میں اس کا دفتر موجود تھا۔ مجھے یاد ہے۔ مولانا شملہ سے واپس کرم آباد جاتے ہوتے ایک آدھ دن کے لئے اسی دفتر میں قیام فرما ہوتے رات کا وقت تھا۔ دفتر کی چھت پر مولانا کے چند عقیدت منداور دوست جمع تھے۔ ڈاکٹر اقبال بھی ملنے کے لئے آگئے تھے۔ شعر خوانی اور لطیفہ بازی کا ہنگامہ گرم تھا۔ یہیں ڈاکٹر صاحب نے "رموزِ بیخودی" کے وہ چند اشعار ترنّم سے سناتے جو اورنگ زیب عالمگیر کی شان میں لکھے گئے تھے ؎

شاہِ عالم گیر گردوں آستاں

اعتبارِ دودمانِ گورگاں ،

درمیانِ کارزارِ کفرودیں

ترکشِ ماراخدنگِ آخریں

کرم آباد پہنچے۔ وہاں سے "ستارۂ صبح" (ہفتہ وار) نکالا۔ پھر حکومت سے اجازت لے کر اس کو لاہور لے آئے اور روزانہ کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں کی جنگجویانہ صحافت کا تقاضا یہ تھا۔ کہ کسی سے لڑائی چھیڑی جاتے۔ حکومت سے لڑنا خارج از بحث تھا۔ ہندوؤں سے دو دو ہاتھ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ مولانا کو آزادی ہی اسی شرط پر ملی تھی کہ سیاسیات میں قطعاً کوئی دخل نہ دیں۔ چنانچہ انہوں نے آجکل کے صوفیوں کے خلاف جنگ وپیکار کی طرح ڈال دی۔ اس زمانے میں خواجہ حسن نظامی، پیر جماعت علی شاہ اور دوسرے سجادہ نشینوں کے خلاف نظم ونثر کے وہ شاہپارے صادر ہوتے کہ مزا آگیا۔ لیکن حکومتِ پنجاب نے اس منازعت کی شدّت پر اعتراض کیا اور سرمائیکل اوڈوائر نے

کوشش کر کے مولانا اور اختر علی خاں دونوں کو حیدر آباد دکن بھجوا دیا۔ تاکہ وہاں دار الترجمہ میں کام کریں۔ پھر وہاں سے مولانا اسی وقت واپس آئے جب جنگ ختم ہو گئی اور تمام پابندیاں اٹھا لی گئیں۔

سالک اور ظفر علی خاں

دوران جنگ میں مشروط آزادی حاصل کرنے کی وجہ سے بعض حلقے مولانا سے بدظن ہو گئے تھے۔ اس لئے مولانا کے نیازمندوں کو ان کا موقف واضح کرنے میں خاصی محنت کرنی پڑی۔ مولانا ایک دفعہ اور عوامی جلسوں میں تقریریں کرنے کے قابل ہوتے اور کچھ مدت کے بعد "زمیندار" دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ اس موقع پر مجھے یاد فرمایا گیا چنانچہ میں زمیندار کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ اور مولانا سے رابطہ زیادہ قریبی اور استوار ہو گیا۔ ایک دن میں نے مولانا سے کہا کہ آج سے سات سال پہلے جب آپ انگلستان سے واپس آتے تھے اور آپ کا عظیم الشان جلوس نکالا گیا تھا۔ میں نے خدا سے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ۔ کوئی ایسا وقت آئے کہ میں اس شخص کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کام کروں۔ وہ دعا آج قبول ہوئی مولانا ہنس دیئے اور کہنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ۔ سالک صاحب آپ نے قبولِ دعا کا ایک قیمتی لمحہ کس بے معنی خواہش کے لئے ضائع کر دیا۔ اگر آپ انہی دنوں میرے پاس آجاتے تو میں آپ کو سات سال پہلے اپنی میز پر بٹھا کر اخبارات مرتب کرانا شروع کر دیتا۔

لڑاکا صحافی

عرض کر چکا ہوں کہ مولانا ظفر علی خان صحافت میں جنگجوئی اور رزم آرائی کے قائل تھے۔

کبھی حکومت کے خلاف مصروفِ جنگ ہیں۔ اخبار کی ضمانتیں ضبط ہو رہی ہیں۔ مقدمے چلاتے جا رہے ہیں اور مولانا قید ہو رہے ہیں۔ کبھی ہندوؤں کے خلاف ہنگامہ برپا ہے اور شدھی اور سنگھٹن کے خلاف "دے رگڑے پہ رگڑا ادھر رگڑا" قسم کی نظمیں لکھی جا رہی ہیں اور سارا ہندو پریس عاجز آ کر چیخ رہا ہے۔ کبھی صوفیوں کی شامت آ رہی ہے۔ کبھی ابنِ سعود کی حمایت اور بدعتیوں کی مخالفت میں زمین آسمان ایک کئے جا رہے ہیں۔ مولانا پر کفر کے فتوے لگاتے جا رہے ہیں۔ پھر کبھی کانگرس کی حمایت میں مسلمانوں کی تحریک حقوق کی مخالفت کی جا رہی ہے اور اس جوش میں ڈاکٹر اقبال بھی مولانا کے حملوں سے محفوظ نہیں رہتے۔ کبھی کانگرسی علماء کی دھجیاں اڑ رہی ہیں اور کبھی انہی کے حق میں مضمون پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔ اگر ان محاذوں سے کبھی فراغت ہوتی ہے تو قادیانیوں کے خلاف وہ شور و غوغا برپا کیا جاتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ احراریوں سے خوش ہیں تو ان کی شان میں قصیدے چھپ رہے ہیں۔ ناراض ہیں تو ان ہی احرار لیڈروں پر نظم و نثر میں نہایت جچتی ہوئی پھبتیوں کا جھاڑ باندھا جا رہا ہے۔

افتتاحیہ نگاری

سالک و مہر کی ادارت زمیندار کے زمانے میں مولانا ظفر علی خاں کو خود مضمون نگاری کا اتفاق کم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دل میں ولولہ اٹھتا اور فرماتے۔ آج افتتاحیہ میں لکھوں گا۔ چنانچہ میز پر چند کتابیں رکھ کر تنہا بیٹھ جاتے۔ دروازے پر آدمی بٹھا دیا جاتا کہ کسی کو اندر نہ آنے دے۔ حقہ بھروا لیا جاتا اور مولانا نہایت تکلف سے اپنے بدیع المثال طرزِ تحریر میں لکھنا شروع کر دیتے۔ فارسی ترکیبوں اور تشبیہوں اور استعاروں سے بھرپور چند

سطریں لکھیں۔ اس کے بعد ہم دفتر میں پہنچ گئے۔ مجھے طلب فرمایا۔ "سالک صاحب میں نے صرف ایک نوٹ لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن یہ تو لیڈر ہوا جا رہا ہے! لیجئے اب آپ ہی اسے پورا کر دیجئے۔" یہ کہہ کر حقّے کی نے منہ میں لے کر الگ بیٹھ جاتے اور میں مولانا کی نامکمل کی ہوئی دو سلپوں کے آگے لکھنا شروع کر دیتا۔ پانچ چھ سلپیں لکھنے کے بعد اسے کاتب کے حوالے کرتا اور خود مولانا کے پاس آ بیٹھتا۔ جو مہر صاحب سے کسی سیاسی مسئلے پر الجھ رہے ہوتے۔

اُردو نظم پر غیر معمولی قدرت

اس کے بعد ہم فرمائش کرتے کہ مولانا فلاں مسئلے پر ایک نظم ہو جائے مولانا کی عادت تھی حقّہ پیتے جاتے اور اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی نوک کو درمیانی انگلی کی نوک پر ملتے جاتے۔ یہ گویا ان کا فکرِ شعر کا طریقہ تھا۔ پھر جو شعر نازل ہونے لگتے۔ تو دیکھتے ہی دیکھتے نظم ہو جاتی۔ جو زمیندار کے صفحۂ اوّل کی زینت ہوتی۔ مولانا ظفر علی خاں پنجاب میں صحیح اور بامحاورہ اُردو لکھنے کے اعتبار سے بالکل بے مثال تھے۔ ایک تو ان کا اُردو سے طبعی لگاؤ۔ دوسرے علی گڑھ اور حیدر آباد دکن میں سالہا سال رہنے کا اتّفاق۔ ان دونوں چیزوں نے ان کو اہل زبان کے نزدیک بھی قابل رشک بنا دیا۔

جذبات و تصوّرات

مولانا ظفر علی خاں خالص جذباتی اور تصوّراتی بزرگ تھے۔ ہر قومی و اسلامی مسئلہ کو جذباتی نُقطۂ نگاہ سے دیکھتے اور پھر اپنے جذبات کے اظہار میں اس قدر غیر محتاط ہو جاتے

کہ انگریز کے قانون کو حرکت میں آنا پڑتا اور مولانا اپنے علاوہ چند کارکنوں اور رضاکاروں کو بھی ساتھ لے کر داخلِ زنداں ہوتے۔ دلیر اور جسور آدمی تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ پولیس کی خاصی جمعیت موجود ہونے کی حالت میں بھی اعلائے کلمۃ الحق میں تامل نہیں کیا۔ تصورات کا یہ حال تھا کہ ایک بہت بڑی سکیم سوچ لیتے اور پھر اس کی تکمیل کے لئے خطابت و صحافت کی قوتوں کو جمع کر کے مصروف ہو جاتے حالانکہ غور و فکر کرنے والوں کے نزدیک وہ سکیم قطعی طور پر قابلِ عمل نہ ہوتی۔ مثلاً ایک دفعہ اسلامی بازار کی تحریک شروع کی۔ اور فرمایا کہ انگلستان کے بڑے بڑے سٹوروں کے اصول پر ایک بہت بڑا اسلامی مرکزِ تجارت قائم کیا جائے۔ جس میں سوئی سے لے کر موٹر کار تک ہر چیز مل سکے۔ اس مرکزِ تجارت کا سرمایہ دس کروڑ ہو جو مسلمانوں سے فراہم کیا جائے اور ملک کے ہر گوشے میں اس مرکز کے ماتحت سٹور قائم کئے جائیں تاکہ مسلمان کوئی چیز ہندو سے نہ خریدیں۔ تھوڑی دیر تک "زمیندار" میں اس اسکیم کے حق میں بڑے گرجتے برستے مضمون درج ہوتے رہے۔ آخر مولانا کو کسی زیادہ دلفریب مشغلے نے گھیر لیا اور اسلامی بازار کی عظیم الشان سکیم گرد و غبار بن کر اڑ گئی۔

ایک اور سکیم

ایک دن میں اور مہر صاحب حاضر ہوئے۔ تو فرمایا۔ آئیے۔ دیکھئے ہم نے ایک سکیم تیار کی ہے کہ مسلمانوں سے ایک بہت بڑا سرمایہ فراہم کیا جائے۔ ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ اگر وہ آنے فی کس بھی دیں تو ایک کروڑ روپیہ فراہم ہوتا ہے۔ اس میں سے کچھ روپیہ "زمیندار" کے بہت بڑے مطبع اور دفتر کی تعمیر پر صرف کیا جائے۔ آپ دونوں کے لئے بھی دو کوٹھیاں اسی احاطۂ "زمیندار" میں تعمیر کی جائیں۔ ایک ہزار

روپیہ ماہوار تنخواہ دے کر علامہ اقبال کو تبلیغِ اسلام کے لئے چین بھیجدیا جائے۔ اور خدا جانے اور کیا کچھ تجویز فرمادیا۔ ہم اس سکیم کی تفصیلات چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر مَیں نے گزارش کی کہ ایک کروڑ روپیہ فراہم کرنے کے لئے محصلین کا جو نظام قائم کیا جائے گا اس پر بھی تو خاصا روپیہ صرف ہو جائے گا۔ آخر وہ کہاں سے مہیّا کیا جائے گا۔

فرمانے لگے۔ جی ہاں۔ مشکل تو یہی ہے کہ روپیہ ہی نہیں۔ ارے یاسین! ذرا حقّہ بھر دو۔ حقّہ آگیا۔ مولانا نے سکیم کو اس کے دھوئیں میں اڑا دیا اور دوسری باتیں کرنے لگے۔

سیر و ورزش

مولانا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ روزانہ سیر اور ورزش باقاعدہ کیا کرتے تھے۔ جب تک لاہور میں تھے ہر صبح مُنہ اندھیرے اٹھتے اور دفتر زمیندار سے چل کر نہر پر پہنچ جاتے۔ یعنی ہر روز چھ سات میل کا چکر کاٹتے۔ مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) مولوی سید ممتاز علی۔ سر گنگا رام۔ راتے بہادر کنج بہاری تھاپر۔ اور اسی قسم کے چند اور بزرگ سیر میں مولانا کے رفیق ہوتے۔ اور دنیا بھر کے مسائل پر بحث ہوتی۔ ایک دن صبح ہی صبح کوئی ساڑھے تین بجے مولانا صرف کرتہ پاجامہ پہنے ننگے سر گھر سے برآمد ہوتے اور سیر کو نکل گئے۔ راستے میں ایک کنسٹیبل نے دور سے بھانپا کہ یہ شخص کوئی واردات کر کے آیا ہے اور اب نہایت تیز قدم گھر کو چلا جا رہا ہے۔ اس نے مولانا کا تعاقب کیا۔ مولانا سمجھ گئے اور ازراہِ شوخی دوڑنا شروع کیا۔ کانسٹیبل بھی ڈبل مارچ کرتا ہوا پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ کوئی میل بھر کی دوڑ کے بعد اس نے مولانا کو آلیا۔ جب آگے

بڑھ کر غور سے دیکھا تو پہچان کر سلام کیا اور کہا۔ مولوی صاحب۔ خدا کے لئے اسوقت ٹوپی اور کوٹ پہن کر نکلا کیجئے۔ خواہ مخواہ ہم لوگوں کو وہم میں نہ ڈالا کیجئے۔ مولانا نے سیر سے واپس آکر یہ قصہ ہم کو سنایا جس پر جی کھول کر قہقہے لگاتے گئے۔

پابندیٔ وضع

پابندیٔ وضع مولانا کی وہ خوبی تھی جو اُس زمانے کے بزرگوں کا طُغرائے امتیاز ہوتی تھی حیدر آباد دکن سے پنجاب آئے تو سر پر ترکی ٹوپی۔ بر میں قمیص۔ آڑا پاجامہ اور حیدر آبادی شیروانی پہنتے۔ رنگ گندمی۔ اور چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی سیاہ ڈاڑھی۔ حرکات و سکنات میں سُرعت اور اچھلاہٹ۔ یہ چیزیں بُڑھاپے تک بدستور قائم رہیں۔ جذباتیت اور تصوّر پرستی میں بھی ذرّہ بھر فرق نہ آیا۔ محمّد علی، شوکت علی، ابوالکلام، حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر انصاری سے برادرانہ تعلّقات تھے لیکن کبھی کبھی تفاوُت طبائع اور حریفانہ مُسابقت کی وجہ سے کسی برابر کے لیڈر سے تکدّر بھی پیدا ہو جاتا لیکن یہ کیفیت بالکل عارضی ہوتی۔ کیونکہ تحریکات کی تُندی و پرشوری اس کو بہالے جاتی۔ اور یہ سب لوگ ایک ہی راہ کے مسافر ہونے کے باعث پھر آپس میں گُھل مل جاتے۔

منٹگمری جیل اور کرم آباد

زمیندار کے عملے کی ہڑتال اور انقلاب کے اجرا کے وقت ہم لوگوں سے بھی خاصا بُعد پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ ہماری نیاز مندی اور کچھ مولانا کی بزرگانہ شفقت اور وضعداری نے اس بُعد کو بہت جلد دوبارہ قُرب میں بدل دیا۔ اور سالک و مہر پھر بدستور مولانا

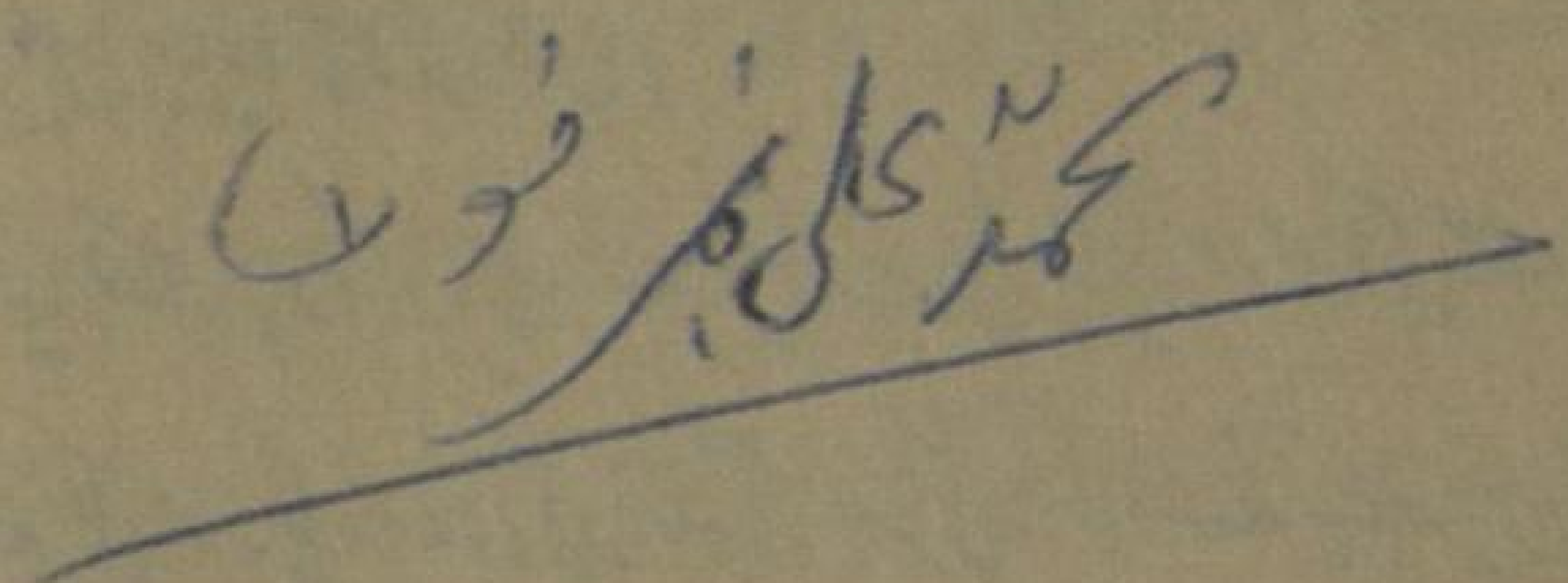
کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی ادبی پھلجھڑیوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جب مولانا تحریکِ ترکِ موالات میں سزایاب ہو کر منٹگمری جیل میں مقیم تھے اور پھر جب مسجد شہید گنج کے سلسلے میں اپنے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ ہم لوگ قریب قریب ہر اتوار کو مولانا سے ملاقات کرنے کے لئے جاتے۔ اور چند گھنٹے بڑے ہی لطف سے وقت کٹتا۔ کرم آباد میں دسترخوان بچھتا۔ تو مولانا بڑی محبت سے خاطر تواضع کرتے اور کہتے کہ اس دسترخوان پر کھانڈ اور نمک کے سوا ہر شے کرم آباد کی پیداوار ہے (یعنی گوشت سبزی ترکاری، گھی، مرچ، دھنیا، لہسن، پیاز، ہلدی، چاول، انڈے، یہ سب اشیاتے خوردنی کرم آباد ہی میں پیدا ہوتی ہیں)

خدا جانے کیا قصہ ہوا کہ آج سے چند سال پہلے مولانا کی صحت یک لخت گر گئی حالانکہ انہوں نے نیکی اور پارسائی کی زندگی بسر کی۔ کھانے پینے میں پوری احتیاط کرتے رہے۔ سیر و ورزش کا ناغہ کبھی نہ کیا۔ یقین تھا کہ وہ آخر وقت تک چاق وچست اور تندرست رہیں گے۔ لیکن خدا کی مرضی۔ ایسے فریشِ بسترِ علالت ہوتے کہ تمام سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔

تراسیویں سالگرہ

پچھلے سال جب میں مولانا کی تراسیویں سالگرہ کے جلسے کی صدارت کے لیے کرم آباد گیا تو مولانا کو خاموش اور بے حس وحرکت دیکھ کر مجھے بیحد صدمہ ہوا۔ وہ بہت ہی کم کسی کو پہچانتے تھے۔ لیکن جب میں سامنے آیا اور اختر علی خان نے ان سے پوچھا۔ ابا۔ آپ نے ان کو پہچانا؟ نہایت دھیمی آواز میں فرمایا۔ ان کو نہ پہچانوں گا تو اور کس کو پہچانوں گا۔ سالک صاحب ہیں"؟ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ شیر جس کی دھاڑ سے کبھی پورا

ہندوستان گونجتا تھا اور جس کا ایک قدم لاہور میں، دوسرا رنگون میں اور تیسرا بمبئی میں ہوتا تھا۔ آج اس کی خاموشی اور بے حرکتی نہایت عمیق درسِ عبرت تھی۔ اب چند سال سے مولانا گرمیوں کے چند مہینے مری میں گزارتے ہیں اور سردیوں میں کرم آباد آجاتے ہیں۔ ان کے برادرِ حقیقی چودھری غلام حیدر خاں دن رات ان کے پاس ہی رہتے اور ان کی تیمارداری اور خبرگیری کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو صحت تندرستی کے ساتھ زندہ رکھے وہ مسلمانانِ ہند و پاک کا بہت عزیز سرمایہ ہیں۔



میاں فضل حسین

پنجاب نے عملی سیاسیات کے دائرے میں جو بڑے آدمی پیدا کئے۔ ان میں میاں فضل حسین کا نام بلاشبہ سرِفہرست ہے۔ اس صوبے میں ان جیسا عالی پایہ، دانشمند ہمہ گیر اور شاطر سیاست دان پیدا نہیں ہوا۔ اور لطف یہ ہے کہ جب وہ نظم ونسق حکومت کے کاموں پر فائز ہوتے تو ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے بھی بے مثال ثابت ہوتے۔ وہ اصلاً نیشنلسٹ اور ہندوستان کی آزادیٔ کامل کے طالب اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اِتحادِ عمل کے حامی تھے۔ لیکن مسلمانوں کے حقوق ومفادات کی حفاظت سے ہرگز غافل نہ تھے۔ پنجاب میں ہندو، مسلمان۔ سکھ زمینداروں کی یونینسٹ پارٹی انہی کی سیاسی فراست کی مخلوق تھی اور اب یہ امر مسلّم قرار پا چکا ہے کہ اگر ملک تقسیم

نہ ہوتا اور دونوں حصّوں میں تبادلۂ آبادی کا ہنگامہ برپا نہ ہوا ہوتا۔ تو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے سوا اور کوئی سیاسی ترتیب صوبے کی عمومی بہبود اور مسلمانوں کی فلاح کی ضامن نہ ہو سکتی تھی۔

ہندوؤں کی طرف سے مُخالفت

جب مانٹیگو چمسفرڈ کی اصلاحات کے ماتحت صوبوں میں دو عملی حکومت قائم ہوئی تو میاں فضل حسین یُونیورسٹی کے حلقۂ انتخاب سے کامیاب ہو کر کونسل کے ممبر اور وزیر تعلیم مقرر ہو گئے۔ چونکہ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ پر ان کے دستخط بھی تھے اس لئے انہوں نے وزارت پر فائز ہوتے ہی ملازمتوں اور کالجوں کے داخلہ میں مسلمانوں کو میثاق لکھنؤ کے مطابق حصّہ دینا شروع کیا۔ اس پر پنجاب کے ہندوؤں اور ان کے اخباروں میں بے حد اضطراب پیدا ہوا۔ کیونکہ ان کے ہاتھوں سے وہ مفادات چھن رہے تھے۔ جن پر وہ اس سے قبل ناواجب طور پر قابض تھے۔ پروفیسر گلشن راتے نے "ٹربیون" میں میاں صاحب کی حکمتِ عملی کے خلاف بے شمار مضامین لکھے اور اردو کے ہندو اخباروں نے تو ان کو ہندو مسلم اتحاد کا دشمن اور ہندو قوم کا مُخالف اور ملک کا غدّار لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن میاں صاحب نے نہایت خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا اور دشنام و بدگوئی سے بالکل متاثّر نہ ہوتے۔ انہی دنوں ایک دفعہ مسز سروجنی نائیڈو لاہور آئیں جن کے دوستانہ تعلّقات میاں صاحب کے ساتھ زمانہ طالب علمی سے چلے آ رہے تھے۔ ان کو میاں فضلِ حسین جیسے نیک طینت اور با اصول آدمی کے خلاف ہندوؤں کی اس بدتمیزی پر بہت غُصّہ آیا۔ چنانچہ وہ ہندوؤں کی سخت مُخالفت کے باوجود میاں صاحب ہی کے

دولت کدے پر فروکش ہوتیں۔

گاندھی جی سے مُلاقات

اتفاق سے انہی دنوں گاندھی جی بھی لاہور آئے۔ سروجنی نے میاں صاحب کے ساتھ ان کی مُلاقات کا بندوبست کیا۔ اس مُلاقات میں چند ہی منٹ کے اندر میاں صاحب نے گاندھی جی کو یقین دلا دیا کہ ان کے خلاف ہندوؤں کا شور وغوغا بالکل بے معنی ہے۔
میاں صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر بات اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کر دیتے تھے۔ اور لمبی چوڑی گفتگو اور طویل بحث کے قائل نہ تھے۔ آپ نے گاندھی جی کو بتایا کہ مَیں پرانا کانگرسی ہوں۔ لیکن جب آپ نے کانگرس پر قبضہ کر کے غیر آئینی طور طریقے اختیار کئے تو ان کو اپنے مذاق کے خلاف پا کر مَیں نے کانگرس کو چھوڑ دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مَیں کانگرس کے اصولِ اساسی اور اس کے نصب العین سے بھی مُنکر ہو گیا ہوں۔ صدہا ایسے کانگرسی ملک میں موجود ہیں جو آپ سے اختلاف رکھنے کے باوجود قوم پرست، حُریت خواہ اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں۔ کیا آپ ان کو فرقہ پرست یا غدارِ وطن قرار دیں گے۔

گاندھی جی نے کہا۔ ہرگز نہیں۔ پھر میاں صاحب نے فرمایا کہ میثاق لکھنؤ پر مَیں نے لیگ کی طرف سے نہیں بلکہ کانگرس کی طرف سے دستخط کئے تھے اس لئے مَیں پنجاب کے مسلمانوں کو جو حقوق دلانے کی کوشش کر رہا ہوں یہ گویا کانگرس کے حُکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ کیونکہ میثاق پر دستخط کرنے والے اس امر کے پابند ہیں کہ اقتدار حاصل ہونے کی صورت میں اس میثاق کی دفعات پر عمل کریں۔ پھر مَیں نے پنجاب میں جو اتحاد پارٹی

قائم کر رکھی ہے وہ ملک بھر میں پہلی سیاسی پارٹی ہے جو فرقہ وار خطوط پر نہیں۔ بلکہ معاشی پروگرام کی بنا پر بنائی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زمینداروں اور کاشت کاروں کو سُود خواروں اور ناواجب طور پر تنگ کرنے والے طبقوں اور افسروں سے نجات دلائی جاسکے۔ اس پارٹی میں ہندو، مسلمان، سکھ تینوں قوموں کے نمائندے شامل ہیں کیا آپ کو اس پارٹی کے مقاصد یا اس کی ترکیب پر کوئی اعتراض ہے؟

گاندھی جی قائل ہو گئے،

گاندھی جی نے جواب دیا کہ کسی صحیح الدماغ آدمی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ کی پارٹی ملک بھر میں پہلی غیر فرقہ وار پارٹی ہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ اب اگر اس پارٹی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں میرا کچھ قصور نہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ پنجاب کی آبادی میں مسلمان زیادہ ہیں۔ بعینہٖ جیسے کانگرس میں ہندوؤں کی اکثریت کے ذمہ دار آپ نہیں ہیں کیونکہ ہندوستان میں اکثریت ہی ہندوؤں کی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب گاندھی جی لاہور سے واپس گئے تو انہوں نے "ینگ انڈیا" میں میاں فضل حسین پر ایک نوٹ لکھا۔ جس میں ان کی بے حد تعریف کی اور بتایا کہ مجھے ان کی وطن دوستی پر ذرا بھی شبہ نہیں اور وہ نہایت ٹھنڈے دماغ کے ہوشمند اولوالعزم اور اصول پرست انسان ہیں۔ اس پر پنجاب کے ہندو اخباروں نے گاندھی جی کو بھی بے نقط کی سنائیں اور لکھا کہ میاں فضل حسین کی عیّاری سے مہاتما جی دھوکہ کھا گئے۔ حالانکہ دھوکہ کھانے کی کوئی بات نہ تھی۔ میاں صاحب کا موقف ہی نہایت اُستوار تھا۔

حکومت ہند میں

پنجاب ہی میں نہیں بلکہ حکومت ہند میں بھی جب میاں صاحب وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوتے۔ ان کی بے نظیر قابلیت کے جھنڈے گڑ گئے ان کے صیغے تو "صحت اراضی اور تعلیم" تھے۔ لیکن ان کی دُور بین نظر سے دوسرے صیغوں کا کاروبار بھی پوشیدہ نہ تھا۔ اور وہ مسلمانوں کی سیاست کے متعلق بھی وائسرائے کو ہر وقت مُفید مشورے دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے حقوق۔ مسلم کانفرنس کے انعقاد۔ گول میز کانفرنس کے نمائندوں کے انتخاب اور ان کے طریق کار کی تجویز میں میاں صاحب اس قدر شبانہ روز محنت کی کہ ان کی صحت پر بہت ناگوار اثر پڑا۔

تحریک کشمیر کا مسئلہ

میاں صاحب کی ذہانت وفطانت اور ذمہ داری بے مثالی تھی۔ انہیں اگر کسی فرد یا جماعت سے کوئی کام لینا ہوتا تو وہ عجیب وغریب "ٹکنیک" سے کام لیتے تھے۔ مثلاً اگر میاں صاحب کا منشا یہ ہو کہ زید مشرق کی طرف جائے تو وہ زید کو مغرب کی طرف جانے کا مشورہ دیتے تھے اور اس مشورے کے ساتھ ایسے دلائل پیش کرتے تھے جس سے زید بھنا جاتے اور مشرق کی طرف چل دے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ میرے ساتھ بھی گزرا۔

کشمیر کی تحریک شدّت سے جاری تھی۔ مہر صاحب ڈاکٹر اقبال کے ساتھ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان گئے ہوتے تھے کہ میاں صاحب چند روز کے

لئے لاہور آتے اور اپنے مرحوم بیٹے نعیم حسین کی کوٹھی واقع جیل روڈ میں ٹھہرے۔ ایک دن میاں صاحب کے پارسی سیکرٹری خان بہادر نادر شاہ نے ٹیلیفون پر مجھ سے کہا کہ میاں صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ میں گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ کشمیری بے حد مصیبت میں ہیں ان کے لئے کچھ کیجئے۔ کم از کم ذمہ دار اسمبلی ہی دِلوا دیجئے۔

میں نے افتتاحیہ لکھا

میاں صاحب نے کہا۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کیا کشمیری بہاولپور اور پٹیالہ کے لوگوں سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں کہ انہیں تو اسمبلی بنانے کا حق دے دیا جائے اور بہاولپور اور پٹیالہ کے لوگوں کو نہ دیا جائے۔ میں نے کہا اگر وہ طلب کریں تو انہیں بھی ملنا چاہیئے۔ سیاسی حقوق کا پڑھنے لکھنے سے کیا تعلق؟ میاں صاحب کہنے لگے تھوڑی بہت تعلیم تو ضروری ہے۔ اَن پڑھوں کو اسمبلی کا ممبر بنانا تو بیکار بات ہے۔ میاں صاحب کی ان کچی دلیلوں کو سُن کر میرا دماغ کھَول اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی۔ اور گھر پہنچکر دو کالم کا ایک افتتاحیہ لکھا۔ جس میں اگرچہ میاں صاحب کا نام نہ لیا۔ لیکن ان کی پیش کردہ دلائل کی خوب دھجیاں اڑائیں اور لکھا کہ آزادی کی شرط تعلیم نہیں بلکہ سیاسی بیداری ہے۔ جن لوگوں نے آزادی کی خاطر جیل، تازیانہ، ضبطی جائداد اور پھانسی تک کی سزائیں ہنسی خوشی برداشت کی ہیں ان کو مطالبہ آزادی کا حق یقیناً حاصل ہے۔

یہ افتتاحیہ دوسرے دن "انقلاب" میں شائع ہوگیا۔ میاں صاحب لاہور سے

جا چکے تھے۔ چوتھے پانچویں روز ان کا ایک خط دہلی سے آیا۔ جس میں مجھے اس مضمون پر داد دی تھی اور لکھا تھا کہ آپ کے افتتاحیہ کا انگریزی میں ترجمہ کرایا جا رہا ہے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میاں صاحب مجھ سے ایسا مضمون لکھوانا چاہتے تھے۔ جبھی انہوں نے اُلٹی سیدھی دلیلیں دے کر مجھے مشتعل کیا اور اپنا مطلب نکال لے گئے۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ مضمون میاں صاحب نے لکھوایا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہ تھا بلکہ میاں صاحب یہ کہہ سکتے تھے اور مَیں خود اس کا شاہد تھا کہ انہوں نے میرے خیال کی مخالفت کی تھی۔ یہ احتیاط ذمہ داری اور خوش تدبیری کی ایک مثال ہے۔

چودھری ظفر اللہ خاں کا تقرر

میاں صاحب حکومت ہند کی ممبری سے سبکدوش ہوتے تو چودھری ظفر اللہ خاں کا تقرر عمل میں آیا۔ اس پر "زمیندار" اور احراریوں نے بیحد شور مچایا کہ میاں فضل حسین مرزائیت نواز ہیں۔ وائسرائے کے نام بے شمار تار دیئے گئے کہ آپ نے مسلمان کی اسامی پر ایک "غیر مسلم" کو مقرر کر دیا ہے۔ ظفر اللہ خان کو نکالئے اور اس کی جگہ کسی مسلمان کو مقرر کیجئے

اس موقع پر "زمیندار" اور احراری سر سکندر حیات خاں، نواب مظفر خاں اور دوسرے یونینیسٹ لیڈروں کے ساتھ اپنے تعلقات کی پینگیں بڑھا رہے تھے اور میاں فضل حسین کی مخالفت میں زمین آسمان ایک کر رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ میاں صاحب چونکہ خود راتے اور ضدی آدمی ہیں ان کے آگے ہماری دال نہ گلے گی۔ اس لئے ان کو لیڈری سے گرا کر سکندر حیات خاں کو پنجاب کا لیڈر بنا دیں۔

اب سُنئے کہ ظفر اللہ خاں کا تقرر کیونکر ہوا۔ میاں صاحب کا بیان تھا کہ جن لوگوں

نے حقیقتہً چودھری ظفر اللہ خاں کو مقرّر کرایا وہ تو معترضین کے ممدوح بنے ہوتے ہیں لیکن مَیں خواہ مخواہ تمام طعن و تشنیع کا نشانہ بن رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے ظفر اللہ خاں کو مقرّر نہیں کرایا۔ گو میرے نزدیک موزوں ترین آدمی وُہی ہیں۔ ہم نے کچھ میاں صاحب سے اور کچھ باخبر لوگوں سے دریافت کیا تو یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ جب میاں صاحب کی سبکدوشی کا وقت آیا تو لارڈ ولنگڈن وائسراتے نے میاں صاحب سے کہا۔ کہ آپ خود اپنا جانشین نام زد کیجئے۔ میاں صاحب نے نواب صاحب چھتاری اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کے نام لئے۔ وائسراتے نے کہا۔ ہمیں زمینداروں کی تنظیم کے لئے یو۔ پی اور سندھ میں ان دونوں کی ضرورت ہے۔ آپ کوئی پنجابی تجویز کیجئے۔ میاں صاحب نے کہا کہ مجھے سُبکدوش ہو کر پنجاب میں آئندہ اصلاحات کو کامیاب بنانا ہے۔ لہٰذا سب ذی اثر اور مفید آدمیوں سے اچھے تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہوں اگر مرکز کے لئے کسی ایک کا نام تجویز کرتا ہوں تو متعدد امیدواروں کو مجھ سے شکایت پیدا ہو گی اس لئے چند یوم کی مُہلت دیجئے۔ مَیں اتحاد پارٹی کو لکھتا ہوں وہ جس کو نام زد کردے اس کے نام پر غور فرما لیجئے گا۔

میاں صاحب کا لائحہ عمل

اس کے بعد میاں صاحب نے ایک طرف چودھری چھوٹو رام کو سارا معاملہ لکھ کر ہدایت کی کہ پارٹی کا اجلاس منعقد کر کے ایک نام منظور کراؤ اور مجھے اطلاع دو۔ دوسری طرف ایک خط میں آپ نے چودھری شہاب الدین کو آئندہ اسمبلی کی صدارت کا یقین دلایا۔ سکندر حیات خاں کو اپنا دستِ راست بنانے کا وعدہ کیا۔ اور فیروز خاں نون کو لندن میں ہائی کمشنر مقرر کرانے کا تیقّن دلایا اور یہ تمام خطوط کانفیڈنشل طور پر لکھے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ جب پارٹی کا اجلاس ہوا تو ان تینوں بزرگوں نے کہہ دیا کہ ہم تو مرکز میں نہیں جانا چاہتے یہ سن کر پارٹی عجب مخمصے میں پڑ گئی۔ اتنے میں غالباً میاں امیر الدین یا کسی اور صاحب نے تجویز پیش کر دی کہ چودھری ظفر اللہ خاں اس سے قبل مرکز میں میاں صاحب کی قائم مقامی بھی کر چکے ہیں۔ اس لئے ان کا نام بھیجدیا جائے۔ وہ احمدی ہیں آئندہ اصلاحات کے موقع پر ہم انہیں ان کے شایانِ شان عہدہ نہ دے سکیں گے۔ کیونکہ احمدیوں کی مخالفت بہت زیادہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہو جائیں۔ سب نے اپنے اپنے ذاتی اجتماعی اور دوسرے مقاصد کے پیش نظر اس تجویز پر صاد کر دیا چودھری صاحب کا نام وائسرائے کو بھیجدیا گیا اور وہ میاں صاحب کے جانشین مقرر ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ میاں صاحب چودھری ظفر اللہ خان ہی کو مقرر کرانا چاہتے تھے۔ لیکن ابتدا سے انتہا تک انہوں نے اس تقرر کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لی بلکہ یہ کام بلطائف الحیل پارٹی سے کرایا۔

چند خصوصیتیں

میاں فضل حسین عام طور پر ترکی ٹوپی اور انگریزی سوٹ پہنتے تھے۔ اور سرکاری اور دفتری مصروفیتوں میں ہیٹ لگایا کرتے تھے۔ وہ پنجاب اور ہند کی حکومتوں میں چودہ سال تک بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن یہ پوری مدت علالت ہی میں بسر ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک پھیپھڑا ڈاکٹروں نے لاعلاج سمجھ کر خشک کر دیا تھا۔ نہ کسی پر سختی کرتے تھے نہ ڈانٹ ڈپٹ اور بد زبانی سے کام لیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود

ان کی شخصیت میں ایک خاص ہیبت تھی۔ جس کی وجہ سے دوست دشمن ان کے ساتھ سنبھل کر بات کرتے تھے۔ سر سکندر حیات خاں کے ہاں تو ہر وقت اہلِ غرض۔ مدّاحوں اور دوستوں کا دربار لگا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ان سے کام کی بات کرنا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن میاں صاحب کی یہ کیفیت نہ تھی۔ ان کے ہاں ایک سَو ملاقاتی بھی ہوتے تو وہ ان کو دو تین گھنٹے کے اندر بھگتا دیتے تھے۔ ہر آدمی کے ساتھ الگ الگ ملاقات کرتے کام کی بات کی۔ کام کی بات سنی اور قصّہ ختم۔ اس کے بعد کوئی شخص ان کے پاس ایک منٹ کے لئے بھی نہ بیٹھ سکتا تھا۔ گپ زنی کے لئے ان کے پاس وقت نہ تھا۔ بات میں ایجاز و اختصار کو انہوں نے "فنِ لطیف" بنا دیا تھا۔ جو شخص اس عزم سے آتا کہ میاں صاحب کی خدمت میں ایک گھنٹہ صرف کر کے اپنا معاملہ سمجھاؤں گا۔ وہ پانچ منٹ کی گفتگو میں مطمئن ہو کر چلا جاتا۔

قائدِ اعظم اور اتّحاد پارٹی

قائدِ اعظم سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ احرار۔ اتّحاد ملت اور دوسری جماعتوں کو مسلم لیگ سے متفق و متّحد کر چکے ہیں اور اب کسر صرف اتنی باقی ہے کہ اتّحاد پارٹی کے مسلمان ممبر بھی شامل ہو جائیں تاکہ اتحادِ مسلمین مکمل ہو جائے۔ میاں صاحب نے فرمایا میں اس کے لئے بالکل تیار ہوں۔ آپ مجھے صرف یہ یقین دلا دیجئے کہ اس اتّحاد کے بعد جو انتخابات ہوں گے اور اسمبلی قائم ہو گی۔ اس میں مسلمان سب کے سب متّحد رہیں گے قائدِ اعظم نے کہا بھلا اس بات کا یقین میں کیونکر دلا سکتا ہوں۔ میاں صاحب نے جواب دیا۔ اگر مسلمان اسمبلی میں متّحد نہ رہے تو لازماً اقلیت میں ہو جائیں گے اور کسی اور جماعت

کو ساتھ ملا کر ہی وزارت قائم کرنی ہو گی۔ پھر اس اتحاد کا عملی فائدہ کیا ہوا؟ اسی صورتحال سے بچنے کے لئے مَیں نے اتحاد پارٹی قائم کر رکھی ہے۔ اس پارٹی میں دو چار کانگرسی احراری وغیرہ مسلمانوں کے سوا باقی سب مسلمان متحد رہتے ہیں اور جو وزارت بنتی ہے اس میں مسلمان مُقتدر حیثیت بھی رکھتے ہیں اور غیر مُسلم ان کی مخالفت بھی نہیں کر سکتے۔ قائداعظم خاموش ہو گئے اور اتحاد پارٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

میاں صاحب بٹالہ کے رہنے والے تھے اور میرے بزرگوں اور ان کے بزرگوں کے درمیان تعلقات و روابط مخلصانہ قائم تھے۔ اس لئے مجھ سے خصوصیت برتتے تھے اور اب ان کے برادران کو چک میاں افضل حسین وائس چانسلر اور میاں امجد حسین (پولیس سروس) کی خدمت میں بھی مجھے نیازِ خصوصی حاصل ہے۔

سردار سکندر حیات خاں

پنجاب کے اربابِ سیاست میں سے میاں فضل حسین اور سکندر حیات خاں دونوں نہایت دانشمند۔ بالغ نظر اور مصلحت بین واقع ہوتے تھے اور انہوں نے صوبے کی اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنی انتہائی صلاحیتیں صرف کیں۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ میاں صاحب میں ایک خاص ہیبت اور "دُور دُور باش" قسم کی کیفیت تھی۔ جس کی وجہ سے اچھے اچھے قابل اور ذی اثر لوگ بھی ان سے رُک کر ملتے اور مُحتاط ہو کر بات کرتے تھے۔ اس کے برعکس سردار سکندر حیات خاں کی شخصیت میں ایک خاص کشش اور محبُوبیت تھی۔ جو مخالفین کو بھی مسحُور کر دیتی تھی۔ لوگ میاں صاحب سے مرعُوب ہوتے تھے لیکن سردار صاحب سے محبّت کرتے تھے۔

پنجاب میں جدید اصلاحات کے ماتحت وزارت مُرتّب کرنے سے پیشتر سردار صاحب ریونیو ممبر اور عارضی گورنر کی حیثیت سے اپنی محنت اور قابلیت کا ثبوت دے چکے تھے۔ ان کا دو دفعہ قائم مقام گورنر ہونا مسلمانوں کے لئے باعث مُسرّت ہوا۔ بلکہ گورنری کے زمانے میں جب وہ نمازِ جمعہ کے لئے شاہی مسجد میں جاتے تو مسلمان پھُولے نہ سماتے اور پُرجوش نعروں سے مسلمان حاکم صوبہ کا استقبال کرتے۔

وضع و قطع

سردار صاحب بالابلند۔ وجیہہ و شکیل۔ چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ انگریزی سوٹ بھی پہنتے اور شیروانی شلوار بھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں سر پر سفید ململ کی پگڑی باندھتے جس پر پنجاب کے زمینداروں کا امتیازی نشان یعنی طُرّہ دستار بہار دیتا تھا۔ کبھی کبھی گھریلو قسم کی مجلسوں میں ترکی ٹوپی بھی پہن لیتے لیکن طُرّہ دار سفید دستار ان کا سرکاری وغیر سرکاری لباس تھا۔ ہیٹ سے نفرت کرتے تھے۔ نہایت جامہ زیب آدمی تھے اور ہمیشہ اعلیٰ درجے کا لباس پہنتے تھے۔ اگرچہ اصلاً واہ ضلع اٹک کے رہنے والے اور خالص کھڑ قبیلے کے زمیندار تھے لیکن لاہور اور علی گڑھ کی تعلیم اور شہری شُرفا اور انگریزوں کے ساتھ خلا ملا کی وجہ سے ان کے اوضاع و اطوار بود و ماند اور بات چیت میں دیہاتی انداز کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا۔ شاہ خرچ اور مہمان نواز آدمی تھے۔ اس لئے اکثر ان کی زمینداری اور ملازمت کی آمدنیاں مل کر بھی ان کے مصارف کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں۔ اور عام طور پر مقرُوض ہی رہتے تھے۔ چنانچہ مرنے کے وقت بھی کم و بیش لاکھ روپے کے مقرُوض تھے۔

ہماری پہلی سیاسی گفتگو

بعض دراندازلوگ ان کے اور میاں فضل حسین کے درمیان کشاکش پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ لیکن سردار صاحب کے دل میں میاں صاحب کا بے حد احترام تھا۔ کیونکہ میاں صاحب کی قابلیت وصلاحیت مُسلّم تھی۔ رسُوخ واقتدار بھی زیادہ تھا۔ اور سکندر حیات خاں ان نوجوانوں میں سے تھے جن کی سیاسی تربیت میاں صاحب ہی کے آغوشِ شفقت میں ہوتی تھی۔ پنجاب کی ملازمتوں کے بعد انہوں نے ریزرو بنک آف انڈیا کی ڈپٹی گورنری کا عُہدہ قبول کر لیا تھا۔ اس زمانے کا ذکر ہے ہم ایک دن مولوی غلام محیّ الدّین قصوری سے بات چیت کر رہے تھے کہ میاں صاحب اور سکندر حیات کی کشمکش کا ذکر درمیان میں آگیا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ لوگ خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ میاں صاحب اور سکندر حیات خاں کے تعلّقات وروابط بے حد مخلصانہ ہیں۔ انہی دنوں سکندر لاہور آتے تو مولوی صاحب نے گولڈنگ روڈ پر کرنل سوڈھی کی کوٹھی میں سکندر کے ساتھ ہماری ملاقات کا انتظام کیا جہاں دو گھنٹے تک ہم نے جی بھر کے ان سے باتیں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پر اس دلفریب شخصیت کے کتنے ایسے پہلو روشن ہوتے جو اس سے قبل آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اور ہمیں یقین ہو گیا کہ میاں صاحب کے بعد پنجاب کا لیڈر یہی ہو سکتا ہے۔ ایک ملاقات مولوی فیروز الدّین (مالک فیروز سنز) مرحوم کے ہاں بھی ہوئی۔ جن سے سر سکندر کا گہرا رابطہ تھا۔

بے نظیر وزارت

اس کے بعد ہمیں سر سکندر کی طبیعت میں بے حد درخور حاصل ہو گیا اور جب میاں صاحب کے انتقال کے بعد سر سکندر نے پنجاب میں اتحاد پارٹی کی وزارت مُرتّب کی۔ تو ہم سے اکثر مشورے کرتے۔ اور جو فیصلہ ہوتا اس پر عمل بھی کرتے۔ اس وزارت میں سر سکندر کے علاوہ چودھری چھوٹو رام۔ سر منوہر لال۔ سر سکندر سنگھ مجیٹھیا۔ ملک خضر حیات خاں اور میاں عبدالحی شامل تھے۔ جدید اصلاحات کو اس وزارت نے پنجاب میں جس پیمانے پر کامیاب کر کے دکھایا۔ اس کے ضامن صرف سر سکندر تھے۔ جنہوں نے دیانت و خدمت کا بلند ترین معیار قائم کر کے اپنے رُفقاء کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ سر سکندر اور سر چھوٹو رام نے اسمبلی میں دھڑا دھڑ ایسے قوانین پاس کئے جن سے زمینداروں کو بے حد تقوّیت پہنچی ساہوکارہ ختم ہو گیا۔ غریبوں کو سُود در سُود کی تباہ کُن مُصیبت سے نجات ملی۔ بیسیوں سالوں کی رہن شُدہ زمینیں واپس مل گئیں۔ مصالحتی بورڈوں کے ذریعے سے کروڑوں روپے کا قرضہ صاف کر دیا گیا اگر جنگِ عظیم کی مصروفیتیں حائل نہ ہو جاتیں تو سر سکندر خدا جانے اور کتنی دُور رس اصلاحات اس صوبے میں نافذ کر دیتے۔

قائدِ اعظم سے وفاداری

جس وقت قائدِ اعظم محمد علی جناح نے حقوقِ مسلمین کا علم بلند کیا تو سردار صاحب ان کے ہم زبان تھے اور ان کو تمام مسلمانانِ ہند کا مختار لیڈر سمجھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ مَیں صرف اپنے صوبے کے باشندوں کا نمائندہ ہوں اور وہ بھی بلا امتیاز

مذہب وملت۔ مَیں پنجاب کی طرف سے بات کرنے کا مجاز تو ہوں لیکن مسلمانوں کے حقوق اور ہندوستان میں ان کے آئندہ موقف کا فیصلہ کرنے کا حق صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور قائد اعظم کو ہے اور مَیں بحیثیت مسلمان ان کے حکم کا پابند ہوں۔

یہاں تک کہ ایک دفعہ پنڈت جواہر لال نہرو لاہور آئے اور علامہ اقبال اور سرسکندر سے مل کر کہنے لگے :-

———— آپ ہمارے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کے متعلق بات کیجئے تو آسانی سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ جناح صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔ ان سے تصفیہ کی گفتگو بے حد مشکل ہے۔ علامہ اقبال تو مسلم لیگ کے لیڈر تھے اور صدر بھی رہ چکے تھے۔ وہ نہرو کی بات کیا سنتے۔ سرسکندر نے بھی پنڈت جی کو یہی جواب دیا کہ مسلمانِ ہند کی سیاست کے تمام مسائل ہم نے قائد اعظم کے سپرد کر رکھے ہیں۔ انہیں ہماری طرف سے سیاہ وسفید کا اختیار حاصل ہے۔ کسی دوسرے شخص کو یہ استحقاق نہیں کہ حقوقِ مسلمین کے متعلق کانگرس یا کسی اور جماعت سے بات کرے۔

کاٹن بل کا قصہ

قائد اعظم بھی سردار صاحب کی فراست اور ان کے اثر ونفوذ اور ان کی وفاداری کی وجہ سے ان پر اعتماد رکھتے تھے اور انہی کو پنجاب میں مسلم لیگ کا سردار تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی کی ترتیب سردار صاحب ہی کی سرکردگی میں کر دی

گئی تھی۔ انہی دنوں ایک واقعہ یہ ہوا کہ قائد اعظم نے مرکزی اسمبلی میں "کاٹن بل" پر تقریر کرتے ہوئے حسب معمول لنکا شائر والوں کے مقابلے میں بمبئی اور احمد آباد کے کارخانہ داروں کی حمایت شروع کر دی۔ ہندوستانی قوم پرستی کے نقطہ نگاہ سے تو یہ چیز صحیح تھی۔ لیکن مسلمانوں کے مفاد کے لحاظ سے مُضر تھی۔ کیونکہ کپاس پیدا کرنے والے قریب قریب سبھی مسلمان ہیں۔ اگر لنکا شائر اور دوسرے خریداروں کے درمیان کھُلا مقابلہ نہ ہو تو کاشت کار کو مناسب قیمت وصول نہیں ہو سکتی۔ خریداروں میں مقابلہ ہونے کی وجہ سے کاشت کار خاصا روپیہ کما لے جاتا ہے۔ سردار صاحب کو یہ دیکھ کر تشویش ہوئی۔ وہ فی الفور دہلی پہنچے اور قائد اعظم کی خدمت میں عرض کیا کہ اب آپ مسلم لیگ کے صدر اور مختار کل ہیں۔ اس لئے صرف مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیجئے۔ ملکی سرمایہ دار اپنے مفادات کی حفاظت خود کریں۔ اب نیشنلزم کو تہ کر رکھئے اور کپاس پیدا کرنے والے غریب مسلمان دیہاتیوں پر ظلم نہ ہونے دیجئے۔ تفصیلات سن کر قائد اعظم پریشان ہوئے اور سر سکندر سے کہنے لگے کہ تم صحیح کہتے ہو۔ پنجاب کے زمینداروں کو میری طرف سے یقین دلا دو کہ آئندہ اس غلطی کا اِعادہ نہ ہو گا۔

خاکساروں کا قضیہ

جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ ایک دن سردار صاحب نے ہم سے ذکر کیا کہ ہندو اور سکھ اپنے والنیٹروں کے دل تیار کر رہے ہیں۔ جو دن رات بازاروں میں مارچ اور میدانوں میں پریڈ کرتے پھرتے ہیں۔ مَیں دورانِ جنگ میں یہ چیز روا نہیں رکھ سکتا۔ اور عنقریب ایسی جماعتوں پر پابندی عائد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندو اور

سکھ فوراً حکم امتناعی پر عمل کریں گے اور اگر کوئی خلاف ورزی کرے گا تو اس سے میں سمجھ لوں گا۔ مجھے اگر اندیشہ ہے تو اپنے شوریدہ سر بھائی علامہ مشرقی سے کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے اس سے متصادم ہونا پڑ جائے۔ اس کے بعد میر مقبول کی وساطت سے بات چیت بھی ہوئی۔ جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر علامہ صاحب کو بلوا کر ان سے براہِ راست گفتگو کی اور یہ قرار پایا کہ خاکساروں کو بیلچہ برداری اور وردی پوشی کی اجازت ہوگی۔ لیکن وہ قطار بندی کر کے سڑکوں پر مارچ نہ کریں گے۔ اس کے بعد علامہ صاحب دہلی چلے گئے بعد کے حالات کی تفصیل سرگزشت میں درج ہو چکی ہے۔

مسلم لیگ کا اجلاس لاہور

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرار پا چکا تھا۔ اور یہ اجلاس بے حد اہم تھا۔ کیونکہ مسلمانانِ ہند پاکستان پر متفق ہو چکے تھے اور اس اجلاس میں اس اتفاقِ آرا کا مظاہرہ کرنا مقصود تھا۔ اجلاس سے دو تین دن پیشتر خاکساروں نے لیگ کے پنڈال کی طرف کوچ کیا۔ پولیس نے روکا۔ تصادم ہوا۔ بہت سے خاکسار مارے گئے۔ شہر کی فضا مکدر ہو گئی۔ لیکن سردار سکندر حیات خاں نے پرلے درجے کے تدبر سے کام لیا۔ قائداعظم تشریف لائے۔ ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مسلم لیگ کا اجلاس بخیر و خوبی منعقد ہوا۔ اور قائداعظم کے تدبر اور سر سکندر کی دردمندی کے باعث فضا کا تکدر مسلمانوں کے سیاسی اجتماع اور ان کے نصب العین کے مؤثر اظہار میں حائل نہ ہو سکا۔

صبر و ایثار

انہی دنوں خبر آئی کہ شوکت حیات خاں زخمی ہو کر دشمن کے ہاتھ قید ہو گئے ہیں لیکن سردار سکندر حیات خاں کے چہرے بشرے اور ان کے معمولاتِ روزمرہ سے ایک لمحے کے لئے بھی کسی اضطراب کا اظہار نہ ہوا۔ وہ بدستور اپنی قوم اور اپنے صوبے کی خدمت میں مصروف رہے۔ غالباً یہ اسی صبر و شکیب اور خاموش دعاؤں کی برکت تھی کہ اپریل ۱۹۴۲ء میں شوکت کی رہائی کی خبر آگئی۔

سر سکندر نے ایک قانون نافذ کرایا جس کا منشا یہ تھا کہ جن اراضی مرہونہ کے رہن پر ساٹھ برس گزر چکے ہیں وہ بغیر کسی ادائیگی کے واگزار کر دی جائیں۔ صرف اس قانون کے اثر سے سردار صاحب کے خاندان کے ہاتھ سے کوئی تین لاکھ روپے کی اراضی نکل گئیں۔ سردار صاحب کو یہ معلوم تھا کہ وہ زمین اُگلنی پڑے گی لیکن انہوں نے قومی مفاد کو ذاتی نفع پر ترجیح دی اور یہ نقصان ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔

خاکسار مساجد میں

خاکساروں کی ہنگامہ آرائی جاری تھی۔ اب انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بیس بیس پچیس پچیس کی ٹولیاں بنا کر مسجدوں میں گھس بیٹھے اور اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنے لگے پولیس نے مسجدوں پر پہرے لگا دیئے۔ خاکساروں کو مساجد کے اندر کھانے پینے کی چیزیں نہ پہنچ سکتی تھیں بعض کھانا پہنچانے والوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ شہر میں اضطراب بہت بڑھ گیا۔ ساٹھ ستر معززینِ شہر کا وفد سردار صاحب کی خدمت میں

حاضر ہوا۔ نوّاب شاہ نواز خان (ممدوٹ) نے نمائندۂ شہر کی حیثیت سے صرف مطلب بیان کیا۔ جس کے جواب میں سردار صاحب نے جو کچھ کہا وہ ان کی اسلامیانہ دردمندی اور ایثار کا مظہر تھا۔ آپ نے کہا۔ وزیراعظم کے پاس وفد لے جانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے پی۔ اے سے وقت مقرّر کیا جاتے۔ لیکن آپ حضرات جو بے تکلفُ اتنی تعداد میں آ گئے ہیں اور کسی ضابطے یا قاعدے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اس کا حق ہے۔ کیونکہ جس آقا کے آپ غلام ہیں اسی کا میں بھی غلام ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ خاکسار حضرات کو بھی اسی آقا کی غلامی کا دعویٰ ہے۔ اگر آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ مجھے میری کوتاہیوں پر ملامت کریں۔ تو کیا آپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ خاکساروں کو بھی مصلحت اندیشی کی نصیحت کریں۔ مَیں تو آپ لوگوں کے حکم کی تعمیل کر دوں گا۔ لیکن کیا وہ بھی آپ کے کسی مشورے کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں؟ مَیں خود بخود تو وزیراعظم کی کرسی پر نہیں بیٹھ گیا۔ آپ ہی لوگوں نے مجھے بٹھایا ہے اور حکم دیا ہے کہ تم اس صوبے میں قانون ونظم کے قیام کے ذمہ دار ہو۔ مَیں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اگر ادائے فرض میں میری طرف سے کوتی غفلت یا غلطی ہو رہی ہے تو آپ بڑے شوق سے فرماد یجئے مَیں اس منصب سے علیحدہ ہو جاؤں گا اور آپ یقین کیجئے کہ اس تبدیلی میں دو گھنٹے سے زیادہ صرف نہ ہوں گے میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔

زندہ باد

اس پر ہر طرف سے آوازیں اُٹھنے لگیں۔ سردار صاحب آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔

ہمارے پاس آپ سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ ہمیں آپ پر کامل اعتماد ہے۔ اس کے بعد سردار صاحب نے ڈپٹی کمشنر لاہور مسٹر بورن کو بلوایا اور حکم دیا کہ مساجد سے پہرے ہٹا لیے جائیں۔ خاردار تار اٹھا لیے جائیں۔ خاکساروں کو کھانا پہنچانے پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔ کسی نمازی کو دِق نہ کیا جائے۔ اور گرفتار شدگان رہا کر دیئے جائیں اس پر وہ تناؤ جو عوام میں پیدا ہو رہا تھا رفع ہو گیا۔ اور بعض مقامات پر سکندر حیات زندہ باد کے نعرے بھی لگائے گئے۔

ڈیفنس کونسل سے استعفا

مسلم لیگ کی اعلان کردہ پالیسی یہ تھی کہ مساعیِ جنگ میں حصہ نہ لیا جائے گو انفرادی طور پر اس کی اجازت تھی۔ سردار صاحب مسلم لیگی ہونے کے باوجود وزیر اعظم پنجاب کی حیثیت سے از سر تا پا خدماتِ جنگی میں منہمک تھے۔ انہی دنوں وائسرائے نے جنگ کے سلسلے میں ایک ڈیفنس کونسل قائم کی۔ جس میں سر سکندر اور مولوی فضل الحق بھی ممبر بنائے گئے۔ قائد اعظم کو اس پر اعتراض تھا۔ یہاں سر سکندر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر مسلم لیگ نے ڈیفنس کونسل کی ممبری پر اعتراض کیا تو وہ عارضی طور پر مع اپنے رُفقاء کے مسلم لیگ سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ اس عزم کے ساتھ وہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس بمبئی میں شامل ہوئے۔ جہاں انہوں نے یہ فرمایا کہ میں مسلم لیگ کے سلسلے میں یا مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ڈیفنس کونسل کا ممبر نہیں بنایا گیا۔ بلکہ پورے پنجاب کے وزیر اعظم کی حیثیت سے لیا گیا ہوں جس میں سبھی قومیں اور ہر سیاسی خیال کے لوگ بستے ہیں اور ان کی عظیم اکثریت خدماتِ جنگ میں مصروف

ہے۔ میں ہرگز مسلمانوں کا لیڈر نہیں ہوں۔ یہ منصب صرف قائد اعظم اور مسلم لیگ کو حاصل ہے۔

اس پر قائد اعظم نے گورنر بمبئی کی ایک مراسلت نکال کر دکھائی جس میں وائسرائے کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ ہم نے مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے سر سکندر، مولوی فضل الحق اور سر سعد اللہ (وزیر اعظم آسام) کو ڈیفنس کونسل کا ممبر منتخب کیا ہے۔ یہ مراسلہ دیکھ کر سر سکندر سخت پریشان ہوئے اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اگر میں مسلمان نمائندے کی حیثیت سے ممبر بنایا گیا ہوں تو یہ غلط ہے۔ لہٰذا میں ابھی نیشنل ڈیفنس کونسل سے مستعفیٰ ہوتا ہوں۔ اس پر مسلم لیگ کے حلقوں نے سر سکندر کے تدبّر اور دانشمندی کی تعریف کی۔ اس کے بعد سر سکندر نے مولوی فضل الحق اور سر سعد اللہ کو بھی ٹیلیفون کر کے استعفے کا مشورہ دیا۔ سر سعد اللہ تو مستعفی ہو گئے لیکن مولوی فضل الحق نے دس دِن کی مُہلت مانگی تاکہ اپنے اُن رُفقا سے بات چیت کر لیں جو بنگال اسمبلی میں یورپینوں کے منتخب نمائندے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی مولوی صاحب ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ نہ دے سکے۔

ایران میں برطانوی فوجیں

جب دورانِ جنگ میں رشید عالی جیلانی کے واقعہ کے بعد انگریزوں نے ایران میں فوجیں داخل کر دیں تو ہم نے علی الاعلان اخبار میں اس کی مخالفت کی۔ سردار صاحب اس پر بہت جز بز ہوئے اور ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے اور مہر صاحب نے کہا کہ جنگ کے بعد بھی انگریز ایران سے نہ نکلیں گے۔ سردار صاحب نے کہا کہ

اگر ایسا ہوگا تو انگریزوں کو وہاں سے نکالنے کی جدّوجہد میں آپ کے ساتھ ہوں گا جب ایرانیوں نے مصالح جنگ کی وجہ سے موجودہ انتظام کو قبول کر لیا ہے تو آپ کو مُدّعی سُست اور گواہ چُست بننے کی ضرورت نہیں۔ اس کو چھوڑ دیجئے اللہ انجام بخیر کریگا۔

سردار صاحب کے سیاسی کارناموں کو بیان کرنے کے لئے تو ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ کہیں سکندر بلدیو معاہدہ ہو رہا ہے۔ کہیں درسی کتابوں کا معاملہ سلجھایا جا رہا ہے۔ کہیں بکری ٹیکس کے خلاف شہری ہندو شورش برپا کر رہے ہیں لیکن ہر معاملے کی تفصیلات سے سر سکندر کی دانشمندی اور شیریں مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہر عُقدے کو پیار محبّت سے اور ہنسی خوشی حل کر لیا کرتے تھے۔

ہنگامۂ شادی اور بربادی

سردار صاحب نے ۱۹۴۲ء کے اواخر میں اپنے بیٹے عظمت حیات خاں اور اپنی بیٹی طاہرہ بیگم کی شادیوں کا اہتمام کیا۔ اتّفاق سے انہی دنوں شوکت حیات بھی میدانِ جنگ سے آ گئے۔ ان کی شادی کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔ ۲۶ دسمبر کو کوئی ڈیڑھ دو ہزار اکابر و شرفائے پنجاب کو ٹی پارٹی دی گئی۔ جس میں انگریز۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ حکام شرفا۔ رؤسا۔ عُلما۔ مشائخ۔ مُدیرانِ جرائد سبھی شامل تھے اور اس عظیم الشّان اجتماع سے صاف ظاہر تھا کہ سر سکندر حیات خاں کے عروج اور ہر دلعزیزی کا آفتاب نصف النّہار پر پہنچ چکا ہے۔

اسی دن رات کو وہ دفعتہً حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے اور ہنستا۔ کھیلتا۔ لہلہاتا ہوا پنجاب غم والم کی گھٹاؤں سے تیرہ و تار نظر آنے لگا۔ حقیقت

یہ ہے کہ متحدہ پنجاب کی شان وشکوہ اور اس کی خوش حالی وخرمی کا آخری دن
وہی تھا۔ جس دن سکندر حیات خاں زندگی سے منہ موڑ کر موت کی وادیوں میں
روپوش ہوگیا۔

چودھری شہاب الدّین

سرو قد۔ ڈاڑھی مُونچھ صاف۔ رنگ کالا۔ سفید ململ کی پگڑی۔ لمبا کوٹ یا اچکن اس پر سفید چُغہ۔ گلے میں سفید دوپٹہ۔ آنکھوں پر عینک۔ آواز بلند اور گرجیلی ـــــــ یہ تھے چودھری سر شہاب الدین۔ لاہور کے نہایت کامیاب وکیل، اور پنجاب کونسل میں زمینداروں کے نمائندے۔

سولہ سال کی عمر میں پڑھنا لکھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کھیتوں میں گھومنے اور کھانے پینے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ آغازِ تعلیم میں تاخیر ہونے کے باوجود اپنی ذہانت و طبّاعی کے باعث اعلیٰ تعلیم تک پہنچے۔ اور ایل ایل بی کرنے کے بعد وکیل بن گئے۔ جب دورانِ تعلیم میں ہاسٹل میں داخل ہوئے تو خوراک کی یہ کیفیت تھی

کہ پچاس پچاس چپاتیاں بیک وقت کھا جاتے تھے۔ اور ہاسٹل میں شور مچ جاتا تھا لڑکپن سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک خوراک کی یہی کیفیت رہی بڑھاپے میں بھی اچھے اچھے جوانوں سے زیادہ کھاتے تھے۔ ایک دفعہ مَیں صبح ہی صبح ملنے گیا۔ چودھری صاحب سیر سے واپس آتے تو لسّی طلب کی۔ گھر میں سے ایک گھڑا لسّی کا اور ایک پیالہ بھیجا گیا۔ اب باتیں کرتے جاتے ہیں اور لسّی پیتے جاتے ہیں۔ چند منٹ میں گھڑا خالی ہو گیا۔

پگڑی سنبھال اوجٹا

موجودہ صدی کے آغاز میں سرمایہ دار ہندوؤں کی سود خوارانہ تباہ کاری کیخلاف ایجی ٹیشن ہوئی۔ جس میں مولانا ظفر علی خان کے والدِ محترم مولوی سراج الدّین احمد نے بھی حصّہ لیا اور ہفتہ وار "زمیندار" جاری کیا۔ چودھری شہاب الدّین نے پنجابی زبان میں ایک نظم "ہاڑا" لکھی جو دیہات میں بے حد مقبول ہوئی۔ اور "پگڑی سنبھال اوجٹا" بھی بچّے بچّے کی زبان پر رواں تھی۔ ایجی ٹیشن کامیاب ہوئی اور قانونِ انتناعِ انتقالِ اراضی نافذ کیا گیا۔ جس کے رو سے غیر زراعت پیشہ لوگ زراعت پیشہ لوگوں کی زمین پر قبضہ کرنے سے محروم کر دیئے گئے۔

ڈاکٹر اقبال کی پھبتیاں

چودھری صاحب سے میری پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب مَیں "زمیندار" کا ایڈیٹر تھا۔ چودھری صاحب پنجابی زبان کے بڑے رسیا اور خود بھی شاعر تھے۔

چنانچہ انہی دنوں انہوں نے دوسری نظموں کے علاوہ "مسدس حالی" کا پنجابی نظم میں ترجمہ کیا جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور پنجاب کے دیہاتیوں پر اس کا اثر اصل "مسدس حالی" سے کم نہیں ہوتا۔ وکالت کے دوران میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ چودھری صاحب کے روابط بہت مخلصانہ تھے۔ اور ان ہی میں ڈاکٹر اقبال بھی تھے۔ جو ہمیشہ چودھری صاحب کو اپنی پھبتیوں کا نشانہ بنائے رکھتے تھے۔ خصوصاً ان کے کالے رنگ کی وجہ سے بعض پھبتیاں بے حد چسپاں ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک دن چودھری صاحب سیاہ سوٹ پہنے سامنے آئے تو ڈاکٹر اقبال نے بے ساختہ کہا "ہائیں چودھری صاحب آج ننگے ہی آ گئے"؟ بار روم میں ڈاکٹر صاحب چودھری صاحب کے متعلق لطیفے تصنیف کر کے دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ کہا کہ مجھے عدالت عالیہ کے جج صاحب نے یاد فرمایا۔ اور کھونٹی پر سے اپنا گاؤن اتارنے لگا کہ پہن کر جاؤں دو تین دفعہ کھینچا تو گاؤن کھونٹی سے نہ اترا آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو چودھری شہاب الدین تھے

نانٹ بغیر ہاکے

ایک دفعہ چودھری دین محمد اور انور جان (طوائف) کے درمیان مقدمہ بازی ہوئی۔ چودھری دین محمد کے وکیل چودھری شہاب الدین تھے۔ اور انور کے وکیل ڈاکٹر اقبال۔ جب جسٹس فورڈ (جج ہائی کورٹ لاہور) کے سامنے پیش ہوتے تو برآمدے ہی میں چودھری صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے وعدہ لیا کہ کمرہ عدالت میں مزاح اور دل لگی سے باز رہیں گے۔ لیکن جب جج نے پوچھا

تو چودھری صاحب

کی رگِ تفنن پھڑکی۔ کہنے لگے۔

(مطلب یہ

تھا کہ جس طرح پرانے زمانے کے نائٹ عورتوں کی حمایت و حفاظت کیا کرتے تھے۔
اسی طرح آج کے نائٹ (سر اقبال) انور جان کی حفاظت کریں گے)

ڈاکٹر صاحب نے فوراً کہا۔ مائی لارڈ۔ میرے اور ان کے درمیان صرف K کا فرق ہے۔ میں K کے ساتھ نایٹ ہوں اور یہ بغیر K کے نائٹ ہیں (یعنی NIGHT) یہ چودھری صاحب کے کالے رنگ پر چوٹ تھی۔ جسٹس فورڈ بے اختیار ہنس دیتے۔ اس وقت تک چودھری صاحب سر نہ ہوتے تھے۔

ایک دفعہ چودھری صاحب سفید کوٹ پہنے ہوتے نظر آتے۔ جو ان کے کالے رنگ کی وجہ سے اور بھی زیادہ سفید معلوم ہوتا تھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے پنجابی میں کہا۔ "کپاہ دے کھیت وچ کٹا وڑ گیا اے"!

مہتر لاہور

جب چودھری صاحب بلدیہ لاہور کے صدر منتخب ہوتے تو اپنی قابلیت اور زور دار شخصیت کی وجہ سے بلدیہ کے کام میں نئی روح پھونک دی۔ ہندو اور سکھ ممبر کبھی کبھی ان کو پریشان کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس قانون دان اور بہادر صدر کے مقابلے میں ہمیشہ منہ کی کھاتے تھے۔ اُن دنوں کا ذکر ہے سر شجاع الملک مرحوم مہتر چترال لاہور آتے اور نواب ذوالفقار علی خاں نے اپنی کوٹھی "زرافشاں" میں انہیں استقبالیہ دیا۔ تمام معززین شہر موجود تھے۔ ڈاکٹر اقبال انہیں مہتر صاحب

سے انٹروڈیوس کر رہے تھے۔ جب چودھری صاحب سامنے آتے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

خان بہادر شہاب الدین چنانکہ جناب والا
مہتر چترال ہستند۔ ایناں مہتر لاہو می باشند

ہر طرف ایک قہقہہ بلند ہوا۔ مہتر صاحب کچھ نہ سمجھے۔ لیکن اہل ذوق عش عش کر اٹھے۔ ایک تو اس میں یہ اشارہ تھا کہ بلدیہ لاہور کے صدر ہیں جو لاہور میں صفائی کی ذمہ دار ہے۔ دوسرے چودھری صاحب کے کالے رنگ پر چوٹ تھی۔ چودھری صاحب پریشان ہوتے۔ لیکن کیا کر سکتے تھے۔ پھبتی بالکل چپک گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک دفعہ ایک اور خود تصنیف لطیفہ سنایا۔ فرمانے لگے ایک دن لاہور کے بھنگیوں اور بھنگنوں نے ہڑتال کر دی۔ چودہری صاحب نے حکم دیا کہ ان سب کو ٹاؤن ہال کی گراؤنڈ میں جمع کیا جاتے۔ جب سب جمع ہو گئے۔ تو چودھری صاحب نے پنجابی زبان میں تقریر شروع کی "بھلیو تے بھراؤ"! اتنے میں ایک بھنگن کا ننھا بچہ رونے لگا۔ اس نے کہا۔ "ارے چپ۔ ارے چُپ ماموں ماریں گے"۔

بلدیہ لاہور اور پھر پنجاب کی قانون ساز کونسل کے صدر کی حیثیت سے چودھری شہاب الدین اپنی حیرت انگیز قانونی قابلیت۔ غیر جانبداری اور موثر و مقتدر شخصیت کے باعث بے حد کامیاب ہوتے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعد ان دونوں اداروں کو ویسا شاندار صدر اب تک نصیب نہیں ہوا۔ جب وہ کونسل میں "آرڈر آرڈر"

پکارتے تھے تو بڑے بڑے سرکش ممبر سہم جاتے تھے۔

چودھری کالو

اور ایک لطیفہ یاد آگیا۔ پنجاب کونسل کے اجلاس میں بجٹ پر بحث ہو رہی تھی۔ کہیں پٹواریوں کی تنخواہ کا ذکر آگیا۔ سیّد محمّد حسین شاہ شیر گڑھ والوں نے تقریر کرتے ہوتے کہا۔

یعنی پٹواری کی حیثیت گاؤں میں کالے چور کی ہے۔ اس پر صدر مجلس چودھری صاحب گرجے "آرڈر۔ آرڈر۔ اَن پارلیمنٹری۔ یہ لفظ واپس لیجئے" خیر۔ شاہ صاحب نے لفظ واپس لے لیا۔

جب کونسل برخاست ہوئی تو ڈاکٹر اقبال نے سیّد محمد حسین شاہ سے کہا۔ آپ نے کمال کیا۔ پٹواری کو چودھری صاحب کے منہ پر کالا چور کہہ دیا۔ حالانکہ چودھری صاحب کے والدِ محترم پٹواری تھے۔ ان کا نام چودھری کالو تھا اور وہ ہمارے صدر سے زیادہ کالے تھے۔ اس پر بہت قہقہے لگاتے گئے۔

ہر چیز بڑی

چودھری شہاب الدین یوں تو ہر اعتبار سے بڑے آدمی تھے۔ وکالت میں بڑے سیاست میں بڑے۔ دولت میں بڑے۔ میاں فضل حسین کے ہمسر و ہمعصر سکندر حیات خاں کے بزرگ ساتھی۔ سالہا سال تک کونسل اور اسمبلی کے سپیکر بھی رہے اور ہر شخص

ان کو اپنا بزرگ مانتا تھا۔ لیکن بڑائی کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ ہر چیز بڑی ہی پسند کرتے تھے۔ کوٹھی بنوائی تو لاہور میں سب سے بڑی۔ اکتالیس کنال زمین اس کوٹھی کے ساتھ تھی۔ ڈلہوزی میں کوٹھی بنوائی تو اس کی ملحقہ زمین اکتالیس ایکڑ تھی۔ یعنی بیاسی بیگھے کے قریب۔ جس میں پہاڑیاں۔ گھاٹیاں۔ جنگل۔ ندیاں۔ چشمے۔ سبھی کچھ تھا اس کوٹھی کا نام "جہاں نما" تھا لیکن جب انگریزی میں لکھا جاتا تھا تو "جہنما" پڑھا جاتا تھا۔ JAHANNUMA

اس لئے میاں احمد یار خاں دولتانہ نے جو چودھری صاحب کے ہم زلف تھے اس کو بدل کر دلنواز کر دیا۔ ڈرائنگ روم بڑے۔ کھانے کے کمرے بڑے۔ پنکھے بڑے۔ لاہور کی کوٹھی کے لان میں ایک بجلی کا پنکھا رکھا جاتا تھا۔ جو ایک منزل کے برابر اونچا تھا۔ اور اس کے نیچے خاصے رقبے میں اس کی ہوا محسوس ہوتی تھی۔ ٹی پارٹیوں میں کیک منگاتے تو وہ بھی "دو منزلے سہ منزلے" ہوتے ——————

غرض چودھری صاحب کے ماحول میں ہر چیز بڑی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اقبال ان کی کوٹھی کو "دیو محل" کہا کرتے تھے۔ یہی کوٹھی ہے جس کو اب میاں ممتاز دولتانہ نے ایک لاکھ روپے سے زیادہ صرف کر کے بالکل ایک نئے محل کی صورت دے دی ہے۔ پہلے اس کوٹھی کی بیرونی دیواریں اینٹوں پر ٹیپ کر کے بنائی گئی تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں فیشن یہی تھا۔ اب سیمنٹ کا پلستر کر دیا گیا ہے۔

جہاں آرا اور خدیجہ بیگم

میاں احمد یار خاں دولتانہ رئیس لڈن اور ان کے صاحبزادے ممتاز محمد خاں دولتانہ کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور اپنی وسیع جائداد کا وارث بھی ممتاز ہی کو قرار دیا تھا۔ کیونکہ خود چودھری صاحب کے ہاں عمر بھر اولاد نہ ہوئی تھی۔ آخر عمر میں دو ماہ کے لئے وزیر تعلیم بھی ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں چونکہ آئندہ انتخابات کے لئے تیاریاں ہو رہی تھیں اس لئے بیگم شاہنواز بھی عورتوں میں اپنا پروپیگنڈہ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر خدیجہ بیگم فیروز الدین ایم اے ڈی لٹ مدارس نسوانی کی ڈپٹی ڈائرکٹریس تھیں۔ چونکہ اپنی لیاقت۔ نیکی اور اسلامیت کی وجہ سے عورتوں کے طبقے میں بہت مقبول تھیں اور یونینسٹوں کو شہری لوگ کچھ اچھا نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے بیگم شاہ نواز کو احساس ہوتا تھا کہ شاید بعض علاقوں میں انہیں ووٹ ملنے میں دِقّت ہو۔ چودھری صاحب جانتے تھے کہ ڈاکٹر خدیجہ بیگم میری برادری سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "وہ اپنی بہن خدیجہ کو ذرا سمجھا دیجئے اس نے جہاں آرا کو تنگ کر رکھا ہے۔ اگر وہ باز نہ آئیں تو میں معطّل کر کے تحقیقاتی کمیٹی بٹھا دوں گا۔" میں یہ سن کر بھپر گیا۔ میں نے کہا۔ چودھری صاحب خدیجہ بیگم سرکاری ملازم ہیں آپ جو چاہیں ان سے سلوک کر سکتے ہیں لیکن جس طرح میاں محمد شفیع آپ کے دوست تھے اسی طرح ڈاکٹر فیروز الدین بھی آپ سے روابط رکھتے تھے۔ ایک بھتیجی کی خاطر دوسری بھتیجی کو نقصان پہنچانا کہاں تک روا ہے دونوں آپ کی بچیاں ہیں۔ دونوں کو بلوا لیجئے اور معاملات کو ہموار کرا دیجئے۔ خدیجہ بیگم کو

دورانِ ملازمت میں الیکشنوں وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں ہوسکتا۔ یونہی کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔ یہ سن کر چودھری صاحب نرم پڑ گئے اور کہنے لگے بہرحال آپ خدیجہ کو ضرور سمجھا دیجئے گا۔

جب چودھری صاحب جدید اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے تو صحت کے انحطاط کا دور شروع ہو گیا تھا۔ بینائی کمزور ہو رہی تھی اور قویٰ بھی جواب دے رہے تھے لیکن آواز کا کڑکا بدستور تھا۔ جب اسمبلی ہال کی کرسیِ صدارت کے اُوپر ان کی سہولت کی خاطر مزید روشنی کے انتظام کے لئے بڑا بلب لگایا گیا تو چودھری چھوٹو رام نے بے ساختہ پھبتی کہی "چراغ تلے اندھیرا" جس کی داد چودھری صاحب نے بھی دی۔

بہترین سپیکر

چودھری شہاب الدین پنجاب کے دوسرے اکابرِ سیاست کے مقابلے میں کسی اعتبار سے کم نہ تھے اور بلا شبہ میاں فضل حسین کے انتقال کے بعد پنجاب کی وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہو سکتے تھے۔ لیکن جمہوریت کے دَور میں تو اصل چیز جتھا بندی ہے جس شخص کے ساتھ اکثریت ہو وہی لیڈر اور وزیر بن سکتا ہے اور چودھری صاحب کے جوڑ توڑ کچھ ایسے واضح طور پر عیارانہ ہوتے تھے کہ لوگوں کو ان کے متعلق سوءِ ظن پیدا ہو جاتا تھا اور دوسرے زیادہ ذی ہنر حریف بازی لے جاتے تھے۔ ورنہ جس طرح وہ سالہا سال تک سپیکر شپ کو نہایت شان سے نباہتے رہے اسی طرح وزارت کو بھی چار چاند لگا دیتے لیکن اس میں بھی کوئی شُبہ نہیں کہ سپیکر شپ کرنا انہی کا حق تھا۔ وہ سب ارباب سیاست کے نزدیک بُزرگ اور واجب الاحترام تھے۔ ان کے فیصلوں سے کوئی

سرتابی کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اور وہ فیصلے بھی نہایت پختہ، مدلّل اور قانونی ہوتے تھے۔

چودھری صاحب نے انگریزی۔ اردو اور فارسی کتابوں کا ایک خاصا ذخیرہ فراہم کر رکھا تھا۔ جو ان کی کوٹھی کی بالائی منزل میں نہایت ترتیب سے محفوظ کیا گیا تھا۔ یہ کتب خانہ چودھری صاحب کی وصیّت کے مطابق پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا اور وہیں موجود ہے۔ آخری ایّام میں چودھری صاحب کی علالت زیادہ تشویشناک ہو گئی اور بعض عوارض دماغی لاحق ہو گئے۔ وہ "الممتاز" کو چھوڑ کر چودھری نذیر حسین صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ جہاں ان کے خیال کے مطابق انہیں زیادہ آرام مل سکتا تھا۔ مَیں اور مہر صاحب ان کی عیادت کو گئے تو انہوں نے بمشکل ایک آدھ لمحے کے لئے ہم کو پہچانا۔ اس کے بعد رونے لگے اور کہنے لگے۔ ابھی سکندر حیات خاں اور چھوٹو رام مجھ سے ملنے آتے تھے حالانکہ وہ دونوں فوت ہو چکے تھے۔ غرض اس قسم کی بے سروپا باتیں کرتے رہے۔ تیسرے چوتھے روز انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت کرے۔

آغا حشر کاشمیری

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری نے جب اپنے گھر کی فضا کو اپنے فنی رجحانات کے خلاف پایا تو بھاگ کر بمبئی پہنچ گئے۔ اور تھیٹر کی دنیا میں اپنے لئے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس وقت حسنِ اتفاق سے چند اور ذہین و طباع نوجوان بھی بمبئی میں موجود تھے۔ چنانچہ آغا حشر۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے بھائی ابوالنّصر غلام یاسین آہ۔ نظیر حسن سخا اور ایک آدھ اور صاحب کی ایک "منڈلی" قائم ہو گئی۔ چند روز مولانا ظفر علی خاں بھی ان میں شامل رہے لیکن جلد ہی کسی کاروبار کے سلسلے میں سومالی لینڈ چلے گئے۔ چونکہ یہ لوگ تلاشِ روزگار کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوئی شغل اختیار کرنے کی

کوشش کی۔ اس زمانے میں کوئی سیاسی سٹیج موجود ہی نہ تھا۔ مذہبی مناظروں کا زمانہ تھا اور لوگ آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مباحثوں میں بڑے ذوق شوق سے شریک ہوا کرتے تھے۔ ان حضرات نے بھی مناظرے کا ایک سٹیج قائم کر لیا۔ اور ایک انجمن نصرت الاسلام کی بنیاد رکھی جس کے آرگن کی حیثیت سے ایک ماہانہ "رسالہ البلاغ" کے نام سے جاری کر دیا۔ مَیں نے اس رسالے کے ایک دو پرچے آغا حشر کے پاس دیکھے۔ اس کے مضامین زیادہ تر دینی اور مناظرانہ ہوتے تھے۔ اور مولانا ابو الکلام اس کو مرتّب کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ان سب دوستوں کی زندگیوں کا مستقبل غیر یقینی تھا۔ اس لئے بے نقاب ہو کر کسی انجمن یا رسالے سے اپنا تعلّق قائم نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس مشکل کو حل کرنے کی یہ تدبیر کی گئی کہ مسمی کالے خاں جوان کا خدمت گار تھا اور بالکل اَن پڑھ اور کُندہ ناتراش واقع ہوا تھا۔ نامِ نہاد طور پر انجمن کا سیکرٹری اور رسالے کا ایڈیٹر بنا دیا گیا اور اس کا نام مولوی عبدالرؤف خاں تجویز ہوا۔ اب گھر پر تو وہی کالے خاں چلتا تھا۔ کالے خاں پانی پلاؤ۔ کالے خاں چلم بھرو۔ ابے کالے خاں اِدھر آ کمبخت کیا کر رہا ہے"۔ لیکن لوگوں کے سامنے اس کو مولوی عبدالرؤف خاں صاحب اور سیکرٹری صاحب اور ایڈیٹر صاحب کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔

بمبئی کی مجلسِ مناظرہ

ہر دوسرے تیسرے دن یہ لوگ کسی نہ کسی پادری یا آریہ سماجی پرچارک کو پکڑ لاتے اور جلسۂ عام میں مناظرہ کر کے اس کا قیمہ کر ڈالتے۔ یہاں تک کہ رام چندر دہلوی

اور پادری طالب الدین جیسے پرانے گھاگ بھی ان کے پنجے میں گرفتار ہوتے مولانا ابوالکلام اور مولانا ابوالنصر کا علم وفضل۔ نظیر حسن سخا کی فی البدیہہ شاعری اور آغا حشر کے زورِ خطابت اور ضلع جگت اور پھبتی میں مہارت۔ غرض اس حربِ مناظرہ کے لئے پورا اسلحہ خانہ موجود تھا۔ جس کا مقابلہ کسی عیسائی یا آریہ کے بس کا روگ نہ تھا۔ ہزاروں لوگ ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور ان مناظرین اسلام کی تقریروں پر جوش وخروش کا اظہار کرتے تھے۔

لیکن مناظرے کا شغل معاشی اعتبار سے ان لوگوں کے لئے کوئی معتدبہ روزگار تو درکنار قوتِ لایموت بھی مہیا نہ کر سکتا تھا اور ہر وقت یہی اندیشہ رہتا تھا کہ عنقریب یہ محفل درہم برہم ہونے والی ہے۔ چنانچہ چند ہی مہینے میں یہ حالت بھی پیش آگئی۔ آغا حشر کو نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں ڈرامہ نویس کی اسامی مل گئی۔ مولانا ابوالکلام اور ان کے بھائی اپنے والد محترم کے انتقال کی وجہ سے کلکتہ چلے گئے۔ نظیر حسن سخا بیمار ہوکر اپنے وطن چلے آئے اور یہ مجلس ختم ہوگئی۔

آغا صاحب ڈرامہ کی دنیا میں

آغا حشر نے نئی ملازمت پر فائز ہوتے ہی ڈرامہ کی دنیا کو اپنی غیر معمولی قابلیت و صلاحیت کا احساس کرادیا۔ اور سب سے پہلے "مُریدِ شک" لکھ کر ڈرامہ میں ایک نیا راستہ پیدا کردیا۔ آغا صاحب سے پہلے اگرچہ احسن۔ بیتاب اور طالب بنارسی کا طوطی بولتا تھا۔ لیکن ان کی نظم ونثر میں وہ شان وشوکت۔ وہ پاکیزگی اور وہ قوت بالکل مفقود تھی جو حشر کی تحریرات میں نمایاں تھی۔ کچھ تو آغا کے اسلوب میں ان کی طبعی شورانگیزی

اور زور آزمائی کا اثر تھا اور کچھ خطابت و مناظرہ کے مشاغل نے انہیں ایسے فقرے چست کرنے کی صلاحیت بخش دی تھی جنہیں عوام بے حد پسند کرتے تھے اور پیہم داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے تھے۔ بمبئی میں آغا حشر نے پے در پے کوئی چھ سات ڈرامے لکھے جو بے حد کامیاب ہوتے۔ اور تھیٹر کی دنیا آغا حشر کے نام سے گونجنے لگی۔ دوسرے ڈرامہ نگاروں نے آغا کو ناکام رکھنے کی بے حد کوشش کی۔ لیکن عصرِ حشر شروع ہو چکا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اس عصر کی رفتار کو روک نہ سکتی تھی۔

آغا صاحب نے متعدد دوسری کمپنیوں کے لئے بھی ڈرامے لکھے جن میں بہت سے شیکسپیئر سے ماخوذ تھے۔ آغا صاحب انگریزی نہ جانتے تھے لیکن بعض احباب سے شیکسپیئر کے ڈراموں کا مقصد و مفاد سمجھ کر نوٹ لکھ لیتے تھے اور پھر اس "پنجر" پر گوشت پوست چڑھا کر اُردو کا ایک غیر فانی شاہکار بنا دیتے تھے۔ بعض لوگ "ماخوذ" ڈراموں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن اس سے آغا کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ان کا اسلوب تحریر شیکسپیئر سے بالکل الگ اور ہندوستان اور اردو کی روحِ اذ کے مطابق تھا۔ علاوہ بریں خود شیکسپیئر کے اکثر ڈراموں کے پلاٹ بھی طبعزاد نہیں ہیں بلکہ ان قصوں کہانیوں پر مبنی ہیں جو شیکسپیئر کے زمانے میں زبان زدِ عام تھیں اور جن کو شیکسپیئر سے قبل بھی بعض مصنفین لکھ چکے تھے۔

آغا کا درجہ

اس مختصر مضمون میں مجھے آغا حشر کے فن پر کچھ عرض کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس پر لکھنے کے لئے بعض دوسرے احباب بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے تو

صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آغا حشر حقیقت میں ایک "نابغہ" تھے۔ جنہوں نے حالات کی نامساعدت اور ملک کے پست معیار کے باوجود نثر۔ شعر۔ خطابت اور ڈرامہ میں بہت ہی بلند مقام حاصل کیا۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدل جاتے۔ ادب کی اقدار میں کتنا ہی تغیّر پیدا ہو جاتے۔ ڈرامہ زندہ رہے یا مر جاتے یا دوبارہ زندگی حاصل کرے۔ ہمارے ادب اور ڈرامہ کی تاریخ میں آغا حشر کا دور ہمیشہ نقادوں کے لئے توجہ اور احترام کا مرکز رہے گا۔ اس باکمال شخص نے بیس پچیس سال تک ڈرامہ کی دنیا میں اس زور و تعدّی کے ساتھ اپنا سکّہ چلایا ہے کہ اس دوران میں اس کے سامنے بڑے بڑوں کے چراغ نہ جل سکے اور کوئی دوسرا ڈرامہ نویس وہ بات پیدا نہ کر سکا جو حشر سے مخصوص تھی۔

پہلی ملاقات

آغا حشر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی جب وہ لاہور میں مقیم تھے۔ اور ڈراما کی دنیا میں کساد بازاری کے باعث بے روزگار سے ہو رہے تھے۔ اہلیہ کی علالت اور اس کے بعد وفات نے بھی ان کو بہت افسردہ دل مردہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے ڈراموں سے ہزار ہا روپیہ کمایا لیکن طبیعت سخی اور لکھ لٹ پائی تھی۔ اپنے متعلقین کی اعانت دریا دلی سے کرتے تھے۔ دوستوں کو کھلا پلا کر اور عیش کرا کر خوش ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر ہاتھ تنگ ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی یہی کیفیت تھی۔ حکیم فقیر محمدؐ چشتی نظامی ان کے جانی و جگری دوست تھے۔ انہی کے ہاں مجھے نیاز حاصل ہوا۔ چند روز حکیم احمد شجاع کے گھر مقیم رہنے کے بعد آغا صاحب

نے بازار جج محمد لطیف (متصل ٹبی) میں ایک بڑا مکان کرائے پر لے لیا۔ جس میں آٹھ دس بڑے بڑے کمرے تھے لیکن وہ سب خالی خو کی بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ صرف ایک باورچی خانہ آباد تھا۔ جس میں آغا صاحب کا کھانا پکتا تھا اور وہ خود ایک چھوٹے سے گلیارے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ فرش پر ایک دری بچھی تھی۔ جس پر ایک صندوقچی تھی۔ کچھ اخبار اور چند کتابیں پڑی رہتی تھیں اور ایک کونے میں تکیہ لگائے نرمے کا رنگین تہمد باندھے اور کشمیری دھسہ اوڑھے آغا حشر متمکن رہا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں "پھول" اور "تہذیب نسواں" کا ایڈیٹر تھا۔ پانچ بجے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر سیدھا آغا صاحب کے ہاں چلا جاتا اور تین چار گھنٹے خوب پُر لطف صحبت رہتی۔ حکیم فقیر محمد اکثر تشریف لے آتے اور مولانا تاجور بھی کبھی کبھی آغا صاحب سے ملنے آجاتے۔ وہیں ایک دن حکیم احمد شجاع صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں ابھی حکیم صاحب کی مسیں بھیگی تھیں۔ سرخ و سفید خوب صورت اور شوخ و طناز نوجوان تھے۔ اور سچ یہ ہے کہ خوب تھے۔

مشاعرہ بزمِ احباب

میری عمر اس زمانے میں اکیس بائیس سال کی ہوگی۔ ادبی زندگی کا آغاز تھا۔ نظمیں اور غزلیں لکھتا تھا اور "بزمِ اردو" کے شاندار مشاعروں میں پڑھتا تھا۔ انہی دنوں حکیم مرزا عبد اللہ صاحب نے "بزمِ احباب" کے نام سے ایک نیا مشاعرہ قائم کیا جس کے چند اجلاس تو شاہ عالمی دروازے کے اندر ہوتے اس کے بعد چونکہ یہ مشاعرہ روز بروز مقبولِ عام ہو رہا تھا اور اندرون شاہ عالمی دروازہ کی جگہ کثرتِ حاضرین کی

متحمل نہ ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کی مجلسیں باغ بیرون موچی دروازہ میں منتقل کر دی گئیں۔ اب بزم کا ایک مُشاعرہ آغا حشر کی صدارت میں ہوا۔ وہ سماں اب تک آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات کا وقت۔ آغا صاحب سرخ و سفید۔ وجیہہ و شکیل آدمی۔ سفید انگرکھا۔ سفید کرتہ اور سفید پاجامہ پہنے بقول حکیم فقیر مُحمّد کھانڈ کے کھلونے" بنے بیٹھے تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں شعراء کو طلب کرتے اور ان کے اچھّے اشعار پر داد دیتے۔ آغا حشر کی وجہ سے ان دنوں حکیم فقیر مُحمّد نے بھی غزل گوئی کا شغل اختیار کر لیا تھا لیکن مشاعروں میں پڑھنے سے گھبراتے تھے۔ اکثر ان کی غزل پڑھنے کا شرف مجھے حاصل ہوتا تھا اور وہ خود مُشاعرے کے عقب میں گندے نالے کے قریب ٹہل ٹہل کر سنتے رہتے تھے۔ آغا حشر کا کلام نہایت پاکیزہ اور عاشقانہ جذبات سے شور لبور ہوتا تھا اور پھر ان کے پڑھنے کا انداز! دو مصرعے پڑھ کر سارے مُشاعرے پر چھا جاتے۔ نقّادوں اور سخن فہموں کو سوچنے اور تأمّل کرنے کا موقع ہی نہ دیتے۔ اور ایسا سماں پیدا کر دیتے کہ خود بخود ہی سب کے سر ہل جاتے اور داد کے سوا اور کوئی اثر مشاعرے بھر میں نظر نہ آتا۔

دوستوں سے ان کی محبّت انتہائی خلوص اور بے تکلفی کی سرمایہ دار تھی جس نوجوان دوست میں کوئی اہلیت دیکھتے اس کو سینے سے لگا لیتے اور اس قدر حوصلہ افزائی کرتے کہ اس کا کلیجا ہاتھ بھر کا ہو جاتا۔ جب ان کے بعض اشعار پر داد دیتے تو صاف کہہ دیتے کہ میاں ہم یونہی فرمائشی داد نہیں دیا کرتے۔ ہم تو صرف ایسے شعر پر داد دیتے ہیں جس سے خود مرعُوب ہو جائیں۔

پانچ ہزار کا چیک

انہی دنوں ایک دن سیٹھ سہراب جی کا آدمی کلکتہ سے آیا اور پانچ ہزار کا چیک ساتھ لایا۔ آغا صاحب ان دنوں ایک ڈراما "جرمِ نظر" یا "آنکھ کا گناہ" لکھ رہے تھے۔ سیٹھ نے کہلا بھیجا کہ یہ پانچ ہزار حاضر ہے۔ اس کے علاوہ آپ جو کچھ فرمائیں گے پیش کر دیا جائے گا۔ اب ڈراما ہمارا ہو گیا۔ آغا نے آدمی کو مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔ جب میں شام کو پہنچا تو بہت خوش تھے اور حسبِ عادت بڑی اونچی تعلّیاں بگھار رہے تھے۔ آغا حشر ڈرامے کا خدا ہے۔ آغا حشر کا مقابلہ ہندوستان بھر کے ڈراما نگار مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ آغا حشر انڈیا کا شیکسپیئر ہے"! میری شوخی کی رگ پھڑکی۔ میں نے برجستہ کہا:" جیسا تھرڈ کلاس انڈیا ہے ویسا ہی اس کا شیکسپیئر ہو گا۔" اس پر بہت بھنّائے۔ میرے ساتھ گالی گلوچ کا لین دین نہ تھا۔ اس لئے بہت بے چین ہوئے۔ گالیاں زبان پر آتی تھیں لیکن رُک جاتی تھیں۔ آخر کہنے لگے:" جانتے ہو پانچ ہزار روپے کتنے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا:" جی ہاں سنا ہے پانچ ہزار کی چھاؤں میں کُتّا بیٹھتا ہے"! بے اختیار ہنس پڑے اور کہنے لگے:" مسخرے پن سے باز نہیں آتے"! میں نے کہا۔ ارشاد فرمائیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بتایا کہ سہراب جی کا آدمی ابھی پانچ ہزار کا چیک دے گیا ہے۔ میں نے کہا تو خدا کا شکر ادا کیجئے۔ یہ تو انکسار کا موقع ہے تعلّی کا مقام نہیں۔ لیکن حشر کی تعلّی تو ایک لاعلاج مرض تھی۔ پھر بدستور بنکارنے لگے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ چیک کلکتہ کے بنک کا ہے اور اس کا روپیہ پندرہ روز سے پیشتر آپ کو نہیں مل سکتا تو طبیعت اعتدال پر آگئی

کہنے لگے خیر پندرہ دن اور سہی۔ آخر اتنے مہینے افلاس ہی میں بسر کئے ہیں۔

عیّاشی

اس کے بعد کہنے لگے۔ چلو آج کہیں چل کر عیّاشی کریں۔ مَیں نے کہا۔ چلو لیکن عیّاشی کے لئے تو چہرہ شاہی درکار ہے۔ یہ چیک تو کام نہیں دے گا۔ کہنے لگے چلو تو سہی۔ خیر۔ گھر سے پیدل نکلے۔ وہاں سے لوہاری دروازے گئے۔ اب ذرا "عیّاشی" ملاحظہ ہو۔ لوہاری دروازے کے باہر جہاں آجکل فضل کا اخباروں کا سٹال ہے۔ ایک شخص "پروفیسر" معراج الدّین نے ایک "پیسہ کمپنی" قائم کر رکھی تھی۔ جہاں کچھ "جوکر" مسخراپن کرتے تھے۔ کچھ بھان متی کے کھیل دکھاتے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی کسی فلم کا کوئی ٹوٹا پھوٹا حصّہ بھی دکھا دیا جاتا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے اور معراج الدّین نے آغا صاحب کی صورت دیکھی تو مارے خوشی اور فخر کے کانپنے لگا۔ اور ہمیں بڑی خاطر مدارات سے پنڈال کے اندر لے گیا۔ لیمنیڈ وغیرہ سے تواضع کی۔ دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد آغا صاحب گھبرا گئے۔ اور مجھ سے کہنے لگے "سالک صاحب۔ گولی مارو یار اس کمپنی کو" میں نے کہا۔ ضرور مارو مجھے پورا اتّفاق ہے۔ خیر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ باہر نکلے تو گنڈیریوں اور مونگ پھلی کی فرمائش کی۔ انارکلی بازار میں دونوں چیزیں مل گئیں۔ مَیں نے اپنے کوٹ کی دونوں جیبیں بھر لیں۔ اور آغا صاحب میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کبھی میرے دائیں طرف ہو جاتے۔ کبھی بائیں طرف۔ اور میری جیبوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر پے در پے مونگ پھلی اور گنڈیریاں نکال کر کھاتے رہے۔ یہاں سے چلتے چلتے میکلوڈ روڈ پر پہنچے۔ یہاں ایک ہی سینما تھا۔ "ایمپرس"

جو آج کل قیصر سنیما ہے۔ اس میں بڑے لمبے لمبے سیریل دکھاتے جاتے تھے۔ وہاں جا بیٹھے۔ ایک آدھ گھنٹہ بیٹھنے کے بعد پھر وُہی ارشاد ہوا "یار سالک گولی مارو"۔ ہم نے بھی کہا "مارو" چنانچہ اٹھے۔ باہر نکلے "عیاشی" ختم ہو چکی تھی۔ رات کے بارہ بجے میں آغا صاحب کو پہنچانے کے لئے بازار حج محمد لطیف تک گیا۔ وہاں پہنچ کر سر ہو گئے کہ اب مَیں آپ کو گوالمنڈی پہنچانے جاؤں گا۔ مَیں نے کہا آپ کیا غضب کرتے ہیں۔ یوں تو رات اسی آوارہ گردی میں ختم ہو جائے گی۔ لیکن وہ میرے ساتھ چل دیئے آخر بھاٹی دروازے کے باہر مَیں نے بے حد منّت سماجت کی ہاتھ جوڑے اور انہیں واپس بھیجا۔

مَوجِ زمزم

انہی دنوں کا ذکر ہے حاجی شمس الدّین مرحوم سیکرٹری انجمن حمایت اسلام نے فرمایا کہ حشر آپ کے دوست ہیں۔ ان سے کہئے انجمن کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے۔ اس کے لئے نظم لکھیں۔ اس سے پہلے آغا کی ایک نظم "شکریہ یورپ" بے حد کامیاب اور مقبول ہو چکی تھی۔ مَیں نے آغا صاحب سے فرمائش کی کہ انجمن کے لئے نظم لکھئے۔ پہلے تو انکار کرتے رہے۔ آخر یہ قرار پایا کہ نظم کا موضوع بھی مَیں تجویز کروں اور ہر بند کے لئے مصرع طرح بھی بتاؤں۔ مَیں نے ہنس کر کہا۔ نظم ہی کیوں نہ لکھ دوں! آخر مَیں نے سب احکام کی تعمیل کی۔ ہر روز شام کو مَیں جاتا تو مجھے ایک بند کے اشعار سناتے اور مجبور کرتے کہ ان پر سخت نُکتہ چینی کرو۔ خیر پانچ سات روز میں نظم مکمّل ہو گئی اور "موجِ زمزم" عنوان قرار پایا۔ وہ بُہتیرا کہتے رہے کہ ابھی اس کے بعض اشعار

کو "پالش" کرنا ہے۔ لیکن میں نظم لے کر بھاگا۔ اور چوک متی پہنچکر منشی فضل الٰہی مرغوب رقم کے حوالے کر دیا جو علامہ اقبال اور حشر کی نظموں کے مستقل کاتب تھے۔ میں نے مرغوب رقم سے کہہ دیا کہ اگر آغا صاحب اس نظم کو دیکھنے کے لئے طلب کریں تو ہرگز نہ دیجئے گا۔ دوسرے ہی دن آغا صاحب نے ایک آدمی ان کے پاس بھیجا کہ ذرا وہ نظم دے دیجئے بعض مصرعے بدلنے ہیں لیکن انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ صاحب ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے۔ نہ میں نے نظم آپ سے لی نہ آپ کو دوں گا۔ سالک صاحب سے کہتے۔ وہ کہہ دیں گے تو بھیج دوں گا۔ آغا صاحب پیچ و تاب کھا کر اور مجھے بُرا بھلا کہہ کر چُپ ہو گئے۔

مُختار بیگم

چند روز کے بعد آغا صاحب کلکتہ چلے گئے اور میڈن تھیٹر میں انہیں دو ہزار روپے ماہانہ کی ملازمت مل گئی وہیں ملکہ موسیقی مختار بیگم عرف وآری امرتسری سے تعلق پیدا ہوا۔ اور وہ تعلّق تادم مرگ رہا۔ اس لئے کہ مختار بیگم بھی آغا صاحب کی طرح اپنے فن کی بے نظیر ماہرہ تھیں اور مزاج شناسی کی اہلیت بھی بدرجہ اُتم رکھتی تھیں۔

۱۹۳۴ء کے اواخر میں آغا صاحب بیمار ہو کر لاہور آ گئے۔ چند روز حکیم فقیر محمد چشتی کے ہاں قیام کیا۔ علاج ہوتا رہا۔ لیکن عارضی سا افاقہ ہوا۔ اس زمانے میں حشر پکچرز کی بنیاد رکھی اور ایک ڈراما بھیشم لکھا۔ ریس کورس روڈ پر سنٹرل جیل کے پاس ایک کوٹھی کرائے پر لی اور وہاں بھیشم کی "کاسٹ" مرتب ہوئی۔ ابھی یہ تیاریاں جاری تھیں

کہ پیغام اجل آن پہنچا اور ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو اُردو ڈراما کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہو گیا۔ چند مخلص دوستوں نے جنازے کو کندھا دیا۔ اور چُپ چاپ اُوّل منزل چھوڑ آئے۔ رہے نام اللہ کا۔

مولانا حسرت موہانی

مَیں نے مولانا حسرت موہانی کا نام اور اُن کے حالات پہلے پہل اُس وقت سُنے۔ جب میری عمر چودہ سال کی تھی۔ یہ ۱۹۰۹ء کا ذکر ہے۔ مولانا نے علی گڑھ کالج سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ایک ایسے پر فحن راستے پر قدم رکھا۔ جس کا تصوّر بھی اس زمانے کے کسی تعلیم یافتہ نوجوان کے متعلق نہ کیا جا سکتا تھا وہ نہایت آسانی سے ڈپٹی کلکٹر بن سکتے تھے۔ کوئی اور بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ کسی ریاست کے وزیر مقرّر ہو سکتے تھے۔ لیکن حُرّیت کیش حسرت نے آزادیٔ ہند کا سپاہی بننا پسند کیا۔ اور بی۔ اے کرنے کے بعد سودیشی کپڑے کی دوکان کھول لی۔ ہمارے زمانے میں تو ادب و سیاست متضاد چیزیں ہیں۔ جو ادیب سیاست یا صحافت میں پڑجاتا

ہے وہ ادب و شعر سے کابلاً بے تعلق ہو جاتا ہے۔ لیکن حسرت نے بیک وقت سیاسی صحافت اور تغزّل دونوں سے اپنا راستہ اُستوار کیا۔ اور اس "دو عملی" زندگی کو آخر تک نباہ دیا۔ آپ نے ۱۹۰۸ء میں ایک ماہانہ رسالہ "اُردوے معلّیٰ" جاری کیا جس میں شعروادب کے علاوہ سیاسی مقالات بھی درج ہوتے تھے۔ اور وہ سیاست بھی گوکھلے اور وقار الملک کی سیاست نہ تھی۔ بلکہ تلک کی تخریبی اور ہنگامہ پرور سیاست تھی۔ جس کا راستہ کانٹوں سے پٹا پڑا تھا۔ چنانچہ اردوتے معلّیٰ کے ایک مضمون کی بنا پر حسرت کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ اور آپ دو سال کے لئے جیل بھیج دیئے گئے۔ جہاں آپ نے انتہائی مشقت اور تکلیف کا زمانہ بسر کیا۔ سال بھر تک مسلسل چکّی پیستے رہے۔ حالانکہ عام اخلاقی قیدیوں کو بھی چند ہفتے سے زیادہ چکّی کی مشقت نہیں دی جاتی۔ اس زمانے میں سیاسی کارکنوں سے عوام کی ہمدردی شرمندۂ اظہار نہ ہو سکتی تھی۔ حکومت انگریزی کے جاہ و جلال کا آفتاب پوری شدّت و حدّت سے روشن تھا اور چند سرپھروں کے سوا کوئی سیاست کا نام بھی نہ لیتا تھا۔

ادبی و سیاسی مصروفیتیں

جس زمانے میں مَیں نے اردوتے معلّیٰ پڑھنا شروع کیا۔ اس میں اردو شعرا کے تذکرے ان کے تلمّذ کے سلسلے۔ قدیم و جدید شعرا کی غزلیں اور حسرت کے نتائج فکر باقاعدہ شائع ہوتے تھے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست پر گرما گرم مضامین بھی درج کیے جاتے تھے۔ حسرت نے "مشاہداتِ زنداں" کے عنوان سے اپنی اسیری کے حالات مرتب کیے تھے جو بالاقساط اردوتے معلّیٰ میں درج ہو رہے تھے اور مولانا

کے یہ شعر ملک بھر میں زبان زدِ عام تھے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی!
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

ان مشاغل کے ساتھ ہی ساتھ مولاناؒ "نکاتِ سخن" کے عنوان سے فنِ شعر کے متعلق ضروری قواعد۔ عیوب و محاسن اور متروکات بھی قلمبند کر رہے تھے۔ اور پرانے شعرا کے دیوانوں کے انتخابات بھی شائع کر رہے تھے۔

میاں بیوی ایک سانچے میں

مولانا سے بالمشافہ نیاز دسمبر ۱۹۱۹ء میں حاصل ہوا۔ جب وہ امرتسر کے سیاسی اجتماعات کے سلسلے میں اسلامیہ ہائی سکول امرتسر کی دوسری منزل پر دوسرے سیاسی کارکنوں کی معیت میں مقیم تھے۔ اور محترمہ نشاط النسا بیگم حسرت بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ مولانا کی غزلیں پڑھ پڑھ کر ان کی شکل صورت کے متعلق جو دلکش تصور قائم تھا وہ انہیں دیکھ کر بالکل کافور ہو گیا۔ سر پر ترکی ٹوپی جس کے کناروں پر ایک ایک انچ چیکٹ جما ہوا۔ گندمی رنگ۔ چہرے پر چیچک کے داغ۔ بھری ہوئی بے ترتیب سی ڈاڑھی۔ زردہ کی شیروانی۔ میلا پاجامہ۔ جوتے نے کبھی پالش کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ آواز کچھ باریک۔ کچھ بھرائی ہوتی۔ اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے میں سادگی اور غربت کے مجسّم

نمونہ ۔ یہی حالت بیگم کی تھی۔ وہ بھی ایک فقیر شوہر کی فقیر بیوی تھیں اور ایک خاصے خوشحال خاندان کی بیٹی ہونے کے باوجود درویشی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔

صحابۂ کرام کی سی زندگی

جو لوگ کہا کرتے ہیں کہ آجکل کے زمانے میں صحابۂ کرام کی سی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ ان کے اس دعویٰ کا عملی جواب حسرتؔ کی زندگی تھی۔ دینی و دنیوی علوم سے بہرہ ور۔ شاعرِ شیوا بیان۔ انگریزی دان۔ سیاسی اعتبار سے نہایت واجب الاحترام شخصیت۔ قلب کے سوز و ساز کی دولت سے مالا مال۔ اربابِ تصوّف سے نسبتِ ارادت رکھنے والا۔ راسخ العقیدہ۔ متّقی مسلمان۔ خوشحالی اور امارت کے تمام مواقع حاصل تھے لیکن طبیعت ان سے نفور تھی۔ بازار سے خود ہی سودا سُلف لے آتے۔ فقیر منش بیوی کھانا پکا دیتی۔ اور صبر و شکر سے کھا لیتے۔ سفر میں ان کا تمام تر سامان صرف ایک بُقچی اور ایک ٹین کا ڈبّا (وضو وغیرہ کے لئے) ہوتا تھا۔ تیسرے درجے سے اُوپر کبھی سفر کا اتّفاق ہی نہیں ہوا۔ اپنے دیوان مرتّب کئے۔ انتخاباتِ شعراء شائع کئے۔ اردوئے معلّٰی بھی مدت تک جاری رہا۔ کھدر اور سودیشی کپڑے کی دکان بھی چلتی رہی آمدنی مشکل ہی سے مصارف کے لئے کافی ہوتی۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہتے۔ چنانچہ احباب کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس فقیر نے دو دفعہ انگلستان کا سفر اختیار کیا اور عُمر بھر میں بارہ حج کئے۔

دفترِ انقلاب میں

ایک دن دفعتہً دفترِ "انقلاب" میں تشریف لے آئے اور بیٹھتے ہی کانگرس اور لیگ کی سیاسیات پر مسلسل باتیں شروع کر دیں۔ گاندھی پرلے درجے کا احمق ہے اور کمبخت ڈرپوک بھی ہے۔ میں نے احمد آباد میں اس کی جان ضیق میں کر دی۔ اب ہر شخص سے کہتا پھرتا ہے کہ حسرت مجھ سے بات کر کے جاتے ہیں تو میں رات بھر سو نہیں سکتا۔ بھلا بتاؤ میں اس سے کیا کہتا ہوں۔ اس کی بیخوابی کی وجہ یہی ہے کہ میں سچی بات کہتا ہوں۔ جو کچھ عوام کے دلوں میں ہے وہ بیان کرتا ہوں۔ اور گاندھی ایچ پیچ کی باتیں کرتا ہے۔ بھلا جب انگریز سے جنگ ہی ٹھہر گئی۔ تو مصلحت بینی کیا معنی تقریر کا یہ فراٹا جاری تھا کہ میں نے روک کر عرض کیا۔ حضرت ان مکروہات کو مجلس عاملہ کے لئے رہنے دیجئے۔ اور مجھے تو کوئی تازہ غزل سنائیے۔ ہنسے اور کہنے لگے ہاں ہاں غزل سنئے اور پھر ترنم سے غزل سنانی شروع کی۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا بیہودہ ترنم تھا۔ لیکن حسرت کا خلوص تھا کہ دل میں بیٹھا جاتا تھا ؎

گلۂ جور نہیں شکوۂ بیداد نہیں
کچھ ہمیں تیری تمنا کے سوا یاد نہیں
گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی مراد
ہائے وہ نکہتِ برباد کہ برباد نہیں

شیخ مبارک علی کے مہمان

لاہور میں عام طور پر شیخ مبارک علی تاجر کتب کے ہاں قیام فرماتے۔ کیونکہ وہاں انہیں سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے پورا آرام ملتا تھا۔ اور آرام نہ بھی ملتا تو وہ محسوس نہ کرتے۔ کیونکہ جفاکشی اور قلت ضروریات ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا ٹرین سے اتر کر صبح سیدھے شیخ مبارک علی کی دکان پر پہنچ گئے۔ دکان ابھی بند تھی اور نو بجے کھلنے والی تھی۔ مولانا نے اپنی بُقچی بغل سے نکال کر دکان کی سیڑھیوں پر رکھی اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔ گھنٹہ بھر کے بعد شیخ صاحب آئے۔ علیک سلیک کے بعد بغل گیر ہوئے اور کہا۔ مولانا آپ نے کمال کر دیا۔ پاس ہی تو گھر تھا وہاں آجاتے۔ کہنے لگے اجی نہیں۔ میں نے کہا مبارک علی آخر یہیں آئے گا۔ سو یہیں بیٹھ گیا۔ گھر پر آ کر کیا کرتا۔

سفرِ انگلستان کے مصارف

انہی دنوں "زمیندار" کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ مولانا انگلستان سے واپس آئے تھے۔ اور عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے وہاں کے حالات سنا رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ مولانا آپ کو غالباً اللہ نے چھپر پھاڑ کر بہت سی دولت دے دی ہے۔ کیونکہ آپ دو دفعہ انگلستان ہو آئے ہیں۔ کہنے لگے انگلستان جانے پر کونسی دولت خرچ ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔ آخر چند ہزار روپے تو صرف ہو ہی جاتے ہیں۔ کہنے لگے۔ میں تو چار سو روپے میں انگلستان چلا بھی جاتا ہوں اور واپس بھی

آجاتا ہوں۔ عرض کیا۔ حضرت وہ ترکیب ہمیں بھی بتا دیجئے۔

کہنے لگے حساب لگا لیجئے۔ لاہور سے کراچی تک تھرڈ کلاس کا کرایہ دس روپے (اس زمانے میں کرایہ یہی تھا) کراچی سے ساحلی جہاز کے عرشے پر خلیج فارس میں بصرہ پہنچ گئے۔ سینتیس روپے لگتے ہیں۔ وہاں سے لاری میں خانقین تک چند روپے خانقین سے "نیرن اوور لینڈ" کی بس میں بیٹھے یہ لوگ ایک پاؤنڈ فی مسافر کرایہ لیتے ہیں اور حیفا پہنچا دیتے ہیں جو خانقین سے کوئی پانسو میل دور ہے اور بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہے۔ وہاں "خدیول میل" کے جہاز بحیرہ روم میں آتے جاتے ہیں۔ چنانچہ کوئی پچاس روپے میں مارسیلز پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں سے کیلے پہنچنے کے لئے ٹرین میں سوار ہوتے اور رود بار انگلستان پر جا پہنچے۔ یہاں البتہ کچھ پیسے زیادہ خرچ ہو جاتے ہیں۔ لیکن لندن تک پہنچنے میں دو سو روپے سے زیادہ صرفہ نہیں ہوتا۔

حسرت لندن میں

فرمایا۔ لندن میں اپنے بہت سے دوست بھی رہتے ہیں اور ہندوستان و پاکستان کے طلبا تو بے شمار ہی ہیں۔ میرے ورود کی اطلاع رائٹر نے اخباروں میں شائع کرائی۔ ریلوے سٹیشن پر اپنے بے شمار اہل وطن موجود تھے۔ اخباروں کے نامہ نگاروں اور فوٹوگرافروں نے گھیر لیا اور دوسرے دن لندن کے ہر اخبار میں میرے حالات با تصویر چھپ گئے۔ اس دن سے واپسی کے دن تک حرام ہے جو لڑکوں نے میرا ایک پیسہ بھی خرچ ہونے دیا ہو۔ اور میں کھاتا بھی کیا تھا۔ روٹی کے دو چار توس اور شوربا۔ باقی لغویات۔ خرافات جو انگریزی کھانے میں ہوتی ہیں وہ مجھے پسند ہی نہیں

دو تین مہینے لندن اور مضافات میں گھومے پھرے۔ سیاسی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور واپس آ گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ جن لوگوں کے پاس دولت وافر ہے وہ تو جو چاہیں کریں لیکن کم پیسے والوں کو چاہیئے کہ آمد و رفت پر دو ڈھائی ہزار صرف کر کے لندن میں صرف ایک مہینہ قیام کرنے کے بجائے میرے طریقے سے کم خرچ سفر کریں اور لندن میں چھ مہینے رہیں۔ ٹامس کک کی تجوریاں بھرنے سے اپنا پیٹ بھرنا بہرحال بہتر ہے۔ مولانا کے سفرِ حج کی کیفیت بھی یہی تھی۔ وہ شروع سے آخر تک درجۂ سوم میں سفر کرتے اور حجاز میں بھی موٹر لاری پر اونٹ ہی کو ترجیح دیتے۔ یوں کوئی دوست اپنے صرف پر انہیں موٹر کار میں لے جاتے وہ اور بات ہے۔

معجونِ مرکّب

مولانا عقائد سیاسی و مذہبی کے اعتبار سے عجب معجونِ مرکّب تھے۔ ان کا خلوص ان کی صداقت، ان کی جرأتِ اظہار۔ ان کی بلندیٔ کردار کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ کانگرس میں تھے تو گاندھی جی سے چار قدم آگے ہی تھے۔ لیگ میں آئے تو حقوقِ مسلمین اور پاکستان اور آزادیٔ وطن کے مسائل پر جناح صاحب سے بھی لڑ پڑتے اور قائدِ اعظم اپنی ضد۔ اپنے قائدانہ ٹھاٹھ اور اپنی آمریّت کے باوجود حسرت سے خم کھا جاتے۔ اور ان کے خلوص اور ان کی بزرگی کا بے حد احترام کرتے۔ حسرت ہمیشہ ہندوستان کی کامل آزادی کے علمبردار رہے مسلمانوں کے حقوق کی حمایت میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے اور پاکستان کے حصول کی کوششوں میں بھی برابر شریک

رہے۔ دینی اعتبار سے نہایت پکے اور پابندِ شریعت مسلمان۔ طریقت کے شعبے میں پیکرِ صدق وصفا اور صاحبِ نسبت بزرگ اقتصادی لحاظ سے کیمونزم کے ہمنوا۔ جذباتِ عاشقی کے اعتبار سے نہایت رنگین مزاج۔ غرض ان کے ذہن میں کئی خانے بنے ہوتے تھے۔ ہر چیز اپنے خانے میں پڑی رہتی تھی۔ اور دوسرے خانوں میں مداخلت نہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے ان سے ہنسی ہنسی میں کہا۔ مولانا۔ آپ کانگرسی، لیگی صوفی، مولوی، عاشق مزاج کیمونسٹ ہیں"۔ بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ ایک دفعہ پھر تو کہنا کہ میں کیا کیا ہوں۔

کانپور کے براتی لاہور میں

پاکستان قائم ہونے کے بعد ۱۹۴۸ء کے موسم گرما کا ذکر ہے۔ ایک دن مولانا تین چار احباب کے ساتھ دفعتہً مسلم ٹاؤن میں میرے غریب خانے پر پہنچ گئے۔ بڑے تپاک سے ملاقات ہوئی۔ مولانا آپ یہاں کہاں؟ کیا پاکستان میں ہجرت کر آئے؟" اجی کہاں کی ہجرت ہندوستان میں اپنے کروڑوں بھائیوں کو چھوڑ کر محض اپنی جان بچانے کے لئے پاکستان بھاگ آنا پرلے درجے کی نامردی اور بزدلی ہے۔ مَیں تو وہیں ڈٹا ہوا ہوں اور وہیں رہوں اور وہی مروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مجھے کوئی سرپھرا ہندو مار ڈالے گا۔ پھر کیا ہے۔ آخر مرنا ہی ہے۔ شہادت کا رتبہ حاصل ہو تو اور کیا چاہیئے۔ مَیں نے پوچھا آپ کیسے تشریف لائے۔ فرمایا۔ اجی وہ کانپور کے تاجر ہیں نا۔ حاجی محمد صدیق۔ ان کے لڑکے کی شادی یہاں ماڈل ٹاؤن کے ایک خاندان میں ہوتی ہے۔ برات کانپور سے ہوائی جہازوں پر آئی ہے۔ اور مَیں براتی ہوں۔ مَیں نے کہا سبحان اللہ۔ براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو۔

روس میں ہماری اکثریت

اس وقت مولانا ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز میں نظام دکن کی حمایت کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ مولانا۔ کسی کمیونسٹ کو کسی ریاست کے والی کی حمایت کرتے نہیں دیکھا۔ یہ بھی آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ اس پر مولانا نے کہا۔ وہ جو آپ کہا کرتے ہیں کہ میں مسلمان اور کانگریسی اور لیگی اور صوفی اور عاشق مزاج اور کمیونسٹ ہوں۔ اس میں ایک چیز کا اور اضافہ کر لیجئے۔ ہر مسئلہ اپنی جگہ ہے۔ کمیونزم اپنی جگہ ہے اور مسلمانوں کی حمایت اپنی جگہ ہے۔ اس صحبت میں ایک بڑے مزے کی بات مولانا نے فرمائی کہ اگر پاکستان۔ افغانستان اور ایران بھی سوویٹ یونین میں شامل ہو جائیں اور ان تینوں ملکوں میں جمہوریہ شورائیہ اشتراکیہ" کا نظام قائم ہو جائے تو روس میں ہماری اکثریت ہو جائے۔ میں نے کہا۔ ہماری سے کیا مُراد ہے۔ کہنے لگے مسلمانوں کی۔ میں نے اس پر قہقہہ لگایا۔ کہنے لگے۔ آپ ہنستے کیوں ہیں۔ میں نے کہا۔ اکثریت تو جمہوریت میں موثر ہوتی ہے ڈکٹیٹری میں کیسی اکثریت۔

میاں افتخار کی کوٹھی پر

پاکستان میں مولانا کی آخری تشریف آوری اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ جب وہ اپنے بارہویں حج سے واپس آئے تھے۔ چند روز کراچی میں رہے۔ افسوس ہے کہ خداوندانِ حکومت اور اکابرِ شہر نے ان کی شایانِ شان پذیرائی میں غفلت کی۔ مولانا کو تو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن ان کے عقیدت مندوں کو صدمہ ہوا۔ جب مولانا نے کراچی

سے لاہور کا عزم کیا تو میاں افتخار الدین نے وہیں سے لاہور اپنے کارکنانِ اخبارات کو ٹیلیفون کر کے ہدایت کی کہ مولانا کو ریلوے سٹیشن سے سیدھے میری کوٹھی لے جاؤ اور ان کے قیام اور آسائش کا بندوبست کرو۔ دوسرے دن مسٹر احمد بشیر اور دوسرے نوجوان ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ انہوں نے مولانا کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ انہیں اوّل و دوم درجوں میں تلاش کر رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے بتایا کہ وہ مولانا جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تیسرے درجے سے اترے ہیں اور حسب معمول بقچی اور ڈبا بغل میں دبائے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مولانا کو جا لیا اور موٹر میں بٹھا کر میاں صاحب کی کوٹھی پر لے گئے۔

تھوڑی دیر میں مجھے میاں صاحب کی کوٹھی سے ٹیلیفون آیا کہ مولانا حسرت آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ٹیلیفون ان کو دیجئے۔ مولانا سے بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا آپ کہاں جا پھنسے۔ کہنے لگے کیا کروں۔ یہ لڑکے گھسیٹ لاتے ہیں۔ آپ آئیے تو باتیں ہوں گی۔ میں اور مہر صاحب اسی وقت خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ ایک پُرتکلف بیڈ روم میں قالین اور صوفے بچھے ہوتے ہیں۔ اور مولانا اپنے مخصوص انداز و لباس میں بستر کی پٹی پر یوں بیٹھے ہیں جیسے اڈے پر کبوتر بیٹھا ہے۔ خیر باتیں ہوئیں اور مجھے یہ دیکھ کر بہت تشویش ہوئی کہ مولانا نہایت لاغر ہو رہے ہیں۔ میں نے مہر صاحب سے کہا کہ مولانا تو دُہرے بدن کے آدمی تھے۔ ان کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے کہا عمر کا تقاضا ہے۔ میں نے کہا مجھے تو اب یہ زیادہ زندہ رہتے نظر نہیں آتے۔ خدا خیر کرے۔

پھر شیخ مبارک علی کے ہاں

ہم ملاقات کر کے واپس آ گئے۔ دو پہر کو جب میں شہر گیا تو کسی کام کے لئے امروز میں مولانا چراغ حسن حسرت سے ملنے کے لئے اتر گیا۔ وہاں مولانا حسرت موہانی اپنے ہم تخلص کے ساتھ گپ زنی میں مصروف تھے۔ میں پہنچا تو کہنے لگے آپ خوب آئے۔ چلئے اب مجھے شیخ مبارک علی کے ہاں پہنچا دیجئے۔ میں تو میاں افتخار کی کوٹھی کے شاہی ساز و سامان سے گھبرا گیا۔ اپنی بقچی اٹھا کے بھاگ آیا ہوں۔ میں نے مولانا کو شیخ صاحب کے ہاں پہنچا دیا جہاں وہ نہایت مسرور اور مخلّی بالطبع ہو کر دوستوں سے گفت گو میں مصروف ہو گئے۔

یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مولانا کا کلام سنا جائے لیکن وہاں مولانا نے شاعری کی مختلف قسموں (عاشقانہ۔ فاسقانہ۔ عارفانہ۔ مضحکانہ اور خدا جانے کیا کیا) پر تقریر شروع کر دی۔ جس میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن ان کی بزرگی کے لحاظ سے حاضرین نے نہایت احترام سے ان کی باتیں سنیں اور جلسہ ختم ہوا۔

۱۲ مئی ۱۹۵۲ء کو یہ خبر اہل ذوق پر بجلی کی طرح گری کہ شہنشاہِ تغزّل سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ۷۷ سال کی عمر پائی۔ اللہ مغفرت کرے۔

مولانا گرامی

مولانا غلام قادر گرامی جالندھر کے رہنے والے تھے اور گگے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں مبدءِ فیاض سے فارسی شاعری میں وہ کمال حاصل ہوا۔ کہ عرفی و نظیری کی یاد تازہ ہوگئی۔ میر محبوب علی خاں نظام دکن کی نظرِ انتخاب نے ان کو اپنے دربار کے لئے منتخب کرلیا۔ چنانچہ آپ شاعرِ دربار اور استادِ نظام کی حیثیت سے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ حیدر آبادی شیروانی اور آڑہ پاجامہ پہنتے تھے۔ سر پر بڑی سی رنگین دستار باندھتے۔ بھری بھری ڈاڑھی۔ موٹے موٹے خدوخال۔ چمکتی آنکھیں۔ بے حد ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج۔ ڈاکٹر اقبال سے خصوصی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب ہی کے دولت کدے پر مجھے سب سے پہلے

مولانا کا نیاز حاصل ہوا۔ ابتدا میں ڈاکٹر صاحب اپنے فارسی اشعار میں ان سے مشورہ بھی لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا گرامی کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو وہ گرامی ہے۔ آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کروگے کہ تم نے گرامی کو سنا ہے۔ اسی طرح مولانا گرامی کے دل میں بھی ڈاکٹر صاحب کی بے حد قدر و وقعت تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبالؔ!
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اِستغراق فِی الشِّعر

گرامی کی طبیعت میں ایک خصوصیت ایسی تھی جو مَیں نے عمر بھر کسی شخص میں نہیں پائی۔ یعنی شعر میں ایسا انہماک تھا کہ باقی تمام امور سے اِنقطاعِ کلی ہوگیا تھا۔ اگر جالندھر سے چل کر لاہور پہنچنا ہے تو کوئی ٹرین میں بٹھا دے اور کوئی لاہور پہنچکر اتار لے ورنہ انہیں بالکل احساس نہ ہوگا کہ کہاں اترنا ہے وہ فکر شعر میں مُستغرق پشاور پہنچ جائیں گے ڈاکٹر اقبال کہا کرتے تھے کہ گرامی شعر میں تلمیذِ رُوح الامین ہے اور باقی تمام معاملات میں کُھڈ ہے۔

جب کبھی حیدر آباد سے رُخصت لے کر آتے تو ڈاکٹر صاحب علی بخش کو جالندھر بھیج دیتے کہ مولانا گرامی کو لِوا لاتے۔ علی بخش کسی نہ کسی طرح انہیں لاہور لے آتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ علی بخش گیا اور ڈاکٹر صاحب کی طرف سے سلام و پیام دے

کر کہنے لگا۔ مولوی صاحب آپ کل صبح میرے ساتھ چلے چلئے۔ کہنے لگے ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔ کیوں نہ چلیں گے (ڈاکٹر ڈاکٹر کی ٹ کو ہمیشہ ت سے بدل دیا کرتے تھے۔) ہمارا دوست ہے۔ اپنے دوست کے ہاں کیوں نہ چلیں گے۔ دوسرا دن ہوا۔ صبح ہی بستر بندھوایا۔ جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پھر خدا جانے جی میں کیا آیا۔ بستر کھلوا دیا۔ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب علی بخش جز بز ہو رہا ہے۔ اس کو سمجھا رہے ہیں۔ کل چلیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔

تیسرا دن آیا۔ پھر بستر بندھ گیا۔ تانگا منگا لیا گیا۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اندر گئے باہر آئے۔ باہر گئے اندر آئے۔ بیگم سے باتیں کیں۔ کچھ ضروری چیزیں لے کر ٹرنک میں ٹھونسیں۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد باہر نکلے۔ گرمی کا موسم تھا۔ تانگے کی نشست تپ گئی تھی علی بخش اگلی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ مولانا پچھلی نشست پر بیٹھے ہی تھے کہ بے چین ہو کر اٹھے۔ ارے تانگہ بہت گرم ہے۔ یہ کہا اور نیچے اتر گئے۔ علی بخش سے کہا کہ تم چلے جاؤ ڈاکٹر سے کہہ دینا کہ تانگہ گرم ہو گیا تھا اب سردیوں میں آئیں گے۔ غرض مولانا کو جالندھر سے لانا بھی ایک شدید مرحلہ تھا۔ جسے علی بخش ہی طے کر سکتا تھا۔ دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا۔

بیگم کا پیغام

جب ایک دفعہ مولانا ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچ گئے تو پھر یہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ پڑے ہیں۔ ساری رخصت یہیں بسر ہو گئی۔ بیگم گرامی (اقبال بیگم ترک تخلص۔ اردو کی شاعرہ تھیں،) پیغام پر پیغام بھیج رہی ہیں۔ لیکن یہاں

کچھ اثر ہی نہیں۔ ایک دن جالندھر کے دو تین آدمی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر مولانا سے ملنے آ گئے۔ بیگم نے ان کو سمجھا کے بھیجا تھا کہ بلطائف الحیل مولانا کو لاہور سے جالندھر واپس آنے پر آمادہ کرنا۔ مولانا نے ان لوگوں سے پوچھا کیوں بھئی ہمارے گھر میں تو خیریت ہے؟ انہوں نے سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ حضرت خیریت تو ہے مگر بیگم صاحبہ کو اسہال ہو رہے ہیں۔ یہ سن کر مولانا سخت مضطرب ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ جس شخص کو اسہال ہونے لگیں وہ مشکل ہی سے بچتا ہے۔ وہ آدمی تو یہ کہہ کر چل دیئے۔ لیکن مولانا کو رٹ سی لگ گئی۔ بیگم کو اسہال ہو رہے ہیں۔ مَیں بھی عجب آدمی ہوں۔ یہاں آکر بیٹھ رہا۔ کہیں کوئی نیکی بدی ہو گئی تو کیا کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب عدالت سے واپس آئے تو ان کے سر پر سوار ہو گئے۔ مَیں فوراً جالندھر جاؤں گا۔ اقبال بیگم کو اسہال ہو رہے ہیں۔ جلدی سے انتظام کرو۔ اب میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا کی کمزوری معلوم تھی۔ انہوں نے نہایت سکون سے سُوٹ اتارا۔ کپڑے تبدیل کئے اور اس دوران میں ایک رُباعی کے تین مصرعے کہہ لیے۔ تھوڑی دیر بعد کہا۔ مولانا خدا فضل کرے۔ لیکن اسہال کوئی خطرناک مرض نہیں۔ یوں آپ جس وقت چاہیں گے۔ مَیں آپ کو جالندھر بھجوا دوں گا لیکن ایک رُباعی ذہن میں اڑ گئی ہے تین مصرعے ہو سکے ہیں چوتھا ہونے میں نہیں آتا۔ اور آپ جانتے ہیں۔ چوتھا مصرع جانِ رُباعی کہلاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تینوں مصرعے سنا دیتے اور کہا۔ ذرا فکر تو کیجئے شائد چوتھا مصرع ہو جاتے۔

چوتھا مِصرع ہو گیا

اب مولانا اس چوتھے مصرِع کی فکر میں مُستغرق ہو گئے اور بیگم کا خیال دھواں بن

کے اڑ گیا۔ بیٹھے ہوئے گنگنا رہے ہیں۔ کھڑے ہوئے گنگنا رہے ہیں۔ حقہ پی رہے ہیں اور گنگنا رہے ہیں۔ ایک آدھ مصرع کہہ کر ڈاکٹر صاحب کو سنایا جو انہیں پسند نہ آیا۔ دوبارہ فکر ہوئی۔ لیکن کوئی مصرع ٹھیک نہ بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب اوپر کے کمرے میں جا کر سو گئے۔ اب مولانا اسی مصرع کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ رات کے تین بجے نہایت چُست و برجستہ مصرع ہو گیا۔ مولانا نے علی بخش کو جگا کر کہا۔ علی بخش جاؤ۔ ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ اس نے کہا۔ مولوی صاحب کوئی تکلیف یا ضرورت ہو تو مجھے حکم دیجئے۔ ڈانٹ کر کہا۔ نہیں تجھ سے کام نہیں ڈاکٹر سے کام ہے۔ وہ بیچارا اوپر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر صاحب جاگ اٹھے۔ علی بخش نے کہا۔ مولوی صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں۔ پوچھا خیر تو ہے؟ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ عرض کیا بظاہر تو بھلے چنگے ہیں۔ خیر۔ ڈاکٹر صاحب سردی میں دھسہ اوڑھ کر نیچے اترے۔ حضرت خیر تو ہے؟ فرمایا۔ اجی سُنو۔ مصرع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مصرع سُن کر داد دی اور اجازت چاہی کہنے لگے اب جا کر سو رہو گے؟ اجی کہاں جاتے ہو۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علی بخش سے کہا۔ میاں اس وقت تو چائے کو جی چاہتا ہے۔ علی بخش نے جھٹ سٹوو روشن کیا۔ چائے پکائی۔ جب چائے تیار ہو گئی۔ تو مولانا کیا فرماتے ہیں۔ آہا۔ اگر اس وقت سنگترے ہوتے تو مزا آ جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش سے کہا۔ جاؤ۔ لوہاری دروازے کے کسی دکاندار کو جگا کر سنگترے لے آؤ۔ بے چارہ علی بخش سُوں سُوں کرتا ہوا لوہاری دروازہ گیا۔ دکاندار کو جگا کر سنگترے لایا۔ مولانا نے بہت مزے لے لیکر کھائے۔ چائے پی اور پھر ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگے۔ اب تم جاؤ اور سو رہو۔ حالانکہ اس وقت سورج نکل رہا تھا۔

دن گوبھی رات گوبھی

ایک دن کھانے پر بیٹھے تو کہا۔ علی بخش۔ آج کل گوبھی نہیں ملتی ؟ عرض کیا حضرت بہت ملتی ہے۔ حکم دیا کہ شام کو گوبھی ضرور پکانا۔ شام کو جب گوبھی پک کر سامنے آئی۔ تو پوچھنے لگے۔ یہ کیا ہے ؟ کہا گیا گوبھی۔ بگڑ کر کہنے لگے۔ صبح گوبھی۔ شام گوبھی، دن گوبھی۔ رات گوبھی۔ بڈھے آدمی کو بادی سے مار ڈالو گے کیا ؟ علی بخش نے کہا۔ آپ ہی نے حکم دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا۔ تم چپ رہو۔ صبح گوبھی کی فرمائش کرنے کے بعد مولوی صاحب اب تک اپنے تصوّر میں خدا جانے کتنی دفعہ گوبھی کھا چکے ہیں۔ تم بھی سچّے ہو اور یہ بھی سچّے ہیں۔

کوہ ہمالیہ

بعض اوقات سردیوں کے موسم میں دفعتہً رات کے وقت انہیں محسوس ہوتا کہ سر کے نیچے تکیہ کافی اونچا نہیں۔ نیچے سے توشک نکال کر لپیٹتے اور سرہانے رکھ لیتے پھر بھی طبیعت مطمئن نہ ہوتی تو لحاف کو گاؤ تکیہ بنا ڈالتے اور پھر صبح کے وقت شکایت کرتے کہ ساری رات جاڑے میں مر گیا۔ تم لوگ کافی بستر کیوں نہیں دیتے۔ علی بخش کہتا۔ مولوی صاحب بستر تو دیا تھا لیکن آپ نے کوہ ہمالیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا اس پر اسے بُرا بھلا کہنے لگتے۔

ایک دفعہ مَیں نے نواب سراج الدّین احمد خاں سائل دہلوی کے متعلّق کہ ان کے لنگوٹیے یار تھے۔ دریافت کیا کہ ان کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ جواب

دیا ُخامی میں پختہ ہوگیا ہے میاں" مَیں اس جامع مانع راستے کو سُن کر پھڑک گیا۔

سعہ اتفاق ملاحظہ ہو کہ مولانا بھی کانوں سے بہرے تھے اور بیگم گرامی بھی اونچا سُنتی تھیں۔ جالندھر کے بعض احباب کا بیان ہے کہ رات کو جب کبھی ہم مولانا کے گھر کے پاس سے گزرتے تو دیوار سے لگ کر خوب شعر سنتے۔ کیونکہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو چلّا چلّا کر اپنے شعر سنایا کرتے تھے۔

ناجائز فائدہ

مولانا گرامی کا ایک نوکر تھا غلام محمدؐ۔ بہت نمازی اور پرہیزگار۔ مکان کے پاس ہی مسجد تھی۔ غلام محمد ہر نماز مسجد میں جا کر پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ مولانا نے آواز دی غلام محمدؐ! کسی نے بتایا۔ ظہر کی نماز پڑھنے گیا ہے۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ پھر آواز دی غلام محمدؐ! پھر کسی نے بتایا کہ عصر کی نماز پڑھنے گیا ہے۔

بہت بگڑے۔ کہنے لگے "جب دیکھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ جب پوچھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ نابکار۔ قربِ مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے" یہ ناجائز فائدہ بھی خوب رہا

نکاحِ ثانی

مولانا گرامی کے ہاں عمر بھر اولاد نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ بعض عزیزوں نے کہا کہ آپ کی اس بیگم سے اولاد نہ ہوگی۔ آپ دوسرا نکاح کیجئے۔ پہلے تو نانا کرتے رہے آخر راضی ہوگئے اور ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہ آئی تھی۔ اقبال بیگم کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ لاہور آ کر ڈاکٹر صاحب سے ملیں اور کہا۔

آپ اپنے دوست کو سمجھاتیے۔ اس بڑھوتی کے زمانے میں اسے نکاح کی کیا سوجھی۔ بیگم بیچاری بہت روتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش کو بھیجکر مولانا کو بلوایا۔ دریافت حال کیا۔ اور کہا۔ آپ نے بُرا کیا۔ اگر اقبال بیگم کے خلاف آپ کو شکایت ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ خواہ مخواہ بلا قصور اس پر سوت لا بٹھائی یہ کہاں کی انسانیت ہے لیکن مولانا تھے کہ پُٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتے تھے۔ نکاح میں کیا حرج ہے؟ نکاح سنّت رسول ہے۔ ملّت کے بڑے بڑے لوگوں نے تین تین چار چار نکاح کئے ہیں۔ میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ میرے بعد میرا نام کون لے گا؟

تیر نشانے پر

ڈاکٹر صاحب اس بے زبان کی تر زبانی سے بہت پریشان ہوئے۔ لیکن آخر شاعر کو زیر کرنے کے لئے جذبات کے حربے سے کام لیا اور کہا کہ اولاد ہی سے نام نہیں رہتا۔ آپ کا کلام مدّت دراز تک زندہ رہے گا اور لوگ آپ کو یاد رکھیں گے۔ لیکن جب روزِ قیامت آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلّم کا دربار لگے گا اور ساری امت حضورؐ کے قدموں میں جمع ہوگی اور اقبال بیگم حضور کا دامن تھام کر فریاد کرے گی کہ اے دو جہان کے آقا۔ میرا انصاف کر۔ عمر بھر مَیں نے اس بڈھے کی خدمت کی۔ لیکن اس نے بے قصور بے گناہ مجھ پر سوکن لا بٹھائی اور میری زندگی کو تلخ کر دیا۔ اُس وقت بڈھا گرامی کیا جواب دے گا۔ اے بوالہوس! کیا تو نے جواب سوچ لیا ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ تیر نشانے پر لگا۔ مولانا گرامی زار زار رونے لگے اور چلّا چلّا کر کہنے لگے۔ یا رسول اللہ! مَیں بھول گیا۔ میرے آقا مجھ سے خطا ہو گئی۔ خدا کے لئے

مجھے معاف کر۔ ڈاکٹر۔ بتاؤ۔ اب میں کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو تسلّی دی اور کہا کہ فوراً واپس جا کر اس عورت کو طلاق دے دو اور حضور کے عتاب سے بچ جاؤ۔ مولانا گرامی نے جا کر اس عورت کو طلاق دے دی۔ اور آدھا مہر بھی ادا کر دیا۔

پان سیر سونا

مولانا بدحواس آدمی تو تھے ہی۔ ایک دن میر محبوب علی خاں نظامِ دکن کا دربار لگا ہُوا تھا۔ حسبِ دستور تمام ارکانِ دربار اپنے اپنے منصب پر کھڑے تھے۔ مولانا بھی اپنے مقام پر استادہ تھے۔ لیکن اِزار بند لٹک رہا تھا۔ حضور نظام کی نگاہ پڑ گئی۔ انہوں نے پیش کارِ حضوری سے کہا۔ گرامی کو دیکھو۔ ازار بند لٹک رہا ہے اور کچھ ہوش نہیں۔

پیش کار پریشان ہوا کہ کہیں عتاب نہ ہو جائے۔ جھٹ بات بنائی۔ اور کہا حضور والا۔ گرامی پریشان رہتا ہے۔ یہاں جو منصب ملتا ہے۔ وہ نوکر چاکر گھوڑا گاڑی میں خرچ ہو جاتا ہے۔ وطن میں ہمشیر کی شادی درپیش ہے (حالانکہ بہن کوئی تھی ہی نہیں۔) یہ پنجاب کے لوگ لڑکیوں کو جہیز میں سونے کے ٹھوس زیور دیتے ہیں۔ اس لئے بیچارہ فکرمند رہتا ہے۔ میر محبوب علی خاں میں پرانے بادشاہوں کی سی فیاضی تھی حکم دیا کہ گرامی کو پان سیر سونا دے دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ گرامی کو پان سیر سونا ملا تو ان کا مُنہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔ پیش کار سے پوچھا۔ اس نے سارا قصّہ سنایا۔ شام کے وقت مولانا اپنے مکان پر یاروں میں بیٹھے دُون کی لے رہے تھے۔ ابھی تو ازار بند لٹک ہی رہا تھا۔ کہ پان سیر سونا ملا۔ اگر کہیں کُھل گیا ہوتا تو دس ملتا۔"

"ٹھن چھڈ یار"

ایک دفعہ کا ذکر ہے حضور نظام نے سرِ دربار مولانا گرامی کو حکم دیا کہ اپنا کلام سناؤ۔ مولانا نے سات اشعار سنا کر تسلیمات پیش کیں۔ (دستور دربار یہی تھا کہ سات شعر سنا کر تسلیم کرو اور ہٹ جاؤ۔ اگر حضور مزید فرمائش کریں تو اور سناؤ ورنہ نہیں) نظام نے کہا اور سناؤ۔ مولانا نے سات اشعار اور سنائے اور تسلیم کی۔ حضور نظام بھی موج میں تھے۔ انہوں نے فرمایا "گرامی اور سناؤ" اس پر مولانا نے بے ساختہ پنجابی میں کہا۔ "ٹھن چھڈ یار میں تھک گیاں،" نظام خدا جانے کچھ سمجھے یا نہیں۔ لیکن مولانا کا پیچھا چھوڑ دیا۔ یہ خود فراموشی کی نہایت دلچسپ مثال ہے۔ شعر سناتے سناتے آپ کو یاد ہی نہ رہا کہ کس کے سامنے شعر پڑھ رہا ہوں۔ اور جب تھک جانے کے باوجود مزید فرمائش ہوئی تو یوں جواب دیا گویا کوئی بے تکلف پنجابی دوست سامنے بیٹھا ہے۔

مختلف لطائف

مولانا کی ذات دلچسپیوں کی پوٹ تھی۔ ان کی ذات سے دن بھر لطائف صادر ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً صبح دس بجے علی بخش نے آکر کہا۔ مولوی صاحب کھانا لیجئے۔ فرمایا۔ واہ علی بخش تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ارے ابھی تو ناشتہ کیا ہے اور ابھی کھانا کھا لوں؟ کوئی ساڑھے دس بجے علی بخش نے کہا۔ مولوی صاحب کھانا لاؤں؟ فرمایا پھر تم نے وہی رٹ لگائی۔ ارے میاں ابھی تو ناشتا کیا ہے۔ علی بخش جا کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا۔ ابھی پندرہ منٹ نہ گزرے ہوں گے کہ مولانا برآمدے میں نکل آئے اور چلانا شروع

کیا۔ علی بخش علی بخش! وہ بھاگا ہوا آیا۔ حکم مولوی صاحب۔ کہنے لگے۔ بڑے بیدرد ہو تم لوگ۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ بھوک سے جان نکلی جاتی ہے اور کھانا نہیں دیتے۔ جلدی سے کھانا لاؤ۔

ایک دن میں تیسرے پہر ڈاکٹر صاحب کے گھر گیا۔ باہر مولانا کرسی پر بیٹھے تھے اور دوسری کرسی پر آٹھ دس سنگترے پڑے تھے۔ مَیں نے کہا مولانا سنگترے منگاتے ہیں! کہنے لگے ہاں۔ ابھی علی بخش بازار سے لایا ہے۔ اب میری رگِ شرارت پھڑکی۔ میں نے کہا۔ مولانا۔ یہ تو کھٹے معلوم ہوتے ہیں۔ کہنے لگے اچھا؟ آپ کہتے ہیں تو ضرور کھٹے ہوں گے۔ یہ علی بخش بڑا ہی احمق ہے۔ اسے کیا معلوم سنگترہ کس کو کہتے ہیں۔ بس جو کچھ کسی نے دیا اٹھا کے لے آیا۔ اس کے بعد علی بخش کو بلا کر کہا کہ یہ کھٹے سنگترے کیوں اٹھا لائے؟ وہ کہنے لگا مولوی صاحب میٹھے ہیں۔ اس پر بگڑ کر کہا واہ میٹھے ہیں سالک صاحب جیسا معتبر آدمی تو کہہ رہا ہے کہ کھٹے ہیں اور یہ میٹھے بتا رہا ہے۔ علی بخش سمجھ گیا۔ ایک طرف ہو کر میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ میں نے سنگتروں کو ٹٹول کر دیکھا۔ اور کہا:۔ مولانا غلطی ہو گئی۔ یہ تو ناگ پوری ہیں۔ ضرور میٹھے ہوں گے۔ یہ سنکر بہت شگفتہ ہوتے اور کہنے لگے جی ہاں ضرور میٹھے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ سارے شمالی ہندوستان میں علی بخش جیسا "سنترہ فہم" آدمی موجود نہیں۔

لاہور میں آخری پھیرا

۱۹۲۹ء یا شاید ۳۰ کا ذکر ہے۔ مولانا گرامی آخری دفعہ لاہور تشریف لاتے وہ قصہ بھی سن لیجئے۔ انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اور نواب

سراج الدین احمد سائل اس میں نظم پڑھنے والے تھے۔ نواب صاحب کے داماد ڈپٹی مرزا عبدالرب امرتسر میں مجسٹریٹ تھے۔ لہٰذا نواب صاحب جلسے سے چند روز پہلے امرتسر پہنچ گئے۔ اور مرزا عبدالرب سے کہا کہ ہمارا ایک پرانا یار گرامی جالندھر میں رہتا ہے۔ اس کو یہاں لے آؤ۔ تو چند روز لطف سے کٹ جائیں گے۔ چنانچہ مرزا صاحب جالندھر گئے اور چوں توں کر کے مولانا گرامی اور بیگم گرامی کو زبردستی موٹر میں ڈال کے لے آئے۔ جس دن جلسہ تھا۔ مرزا صاحب نواب سائل اور مولانا گرامی کو موٹر میں بٹھا کر لاہور لائے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں انجمن کے کارکنوں سے کچھ آزردہ تھے اور جلسے میں جانے سے انکار کر چکے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ آپ جلسے میں جائیے اگر گرامی آ گئے ہوں تو ان کو کسی طرح لوا لائیے۔

جلسے میں نواب سائل نے لاٹ صاحب پنجاب کے زیرِ صدارت نظم پڑھی شیخ عبدالعزیز مرحوم سیکرٹری انجمن نے مولانا سے بہت اصرار کیا کہ آپ بھی چند اشعار سنائیے آپ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ مَیں میر محبوب علی خاں کا شاعرِ دربار ہوں۔ فرنگیوں کے سامنے شعر نہیں سنا سکتا۔ خیر جلسہ ختم ہوا۔ مولانا اور نواب صاحب کار کی طرف بڑھے تو مَیں نے جا لیا اور عرض کیا کہ میں سالک ہوں۔ اخاہ کر کے لپٹ گئے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کا پیغام دیا تو آپ کچھ تامل اور عذر کرنے لگے۔ مَیں نے نواب سائل صاحب سے گزارش کی۔ کہ آپ ہی ذرا سفارش فرما دیجئے۔ وہ کہنے لگے سالک صاحب گرامی تو بادشاہ ہیں۔ جی چاہے گا چلے جائیں گے۔ نہ چاہے گا تو کسی بڑی سے بڑی سفارش سے نہ جائیں گے۔ ابھی ہم امرتسر سے لاہور آ رہے تھے۔ اٹاری پر ذرا کی ذرا کار رکی تو مولانا اتر کر پیدل امرتسر کی طرف چل دیئے اور ہم سے کہنے لگے

کہ تم لوگ لاہور جاؤ۔ مَیں امرتسر جاتا ہوں۔ میرا لاہور میں کیا کام۔

خیر۔ مَیں نے منت سماجت کر کے مولانا کو کار سے اتار لیا۔ حفیظ جالندھری کہیں سے آنکلے۔ مَیں نے کہا۔ بھاگ کر ایک تانگہ لے آؤ۔ وہ تانگہ لائے تو ہم مولانا گرامی کو ساتھ لے کر ڈاکٹر اقبال کے ہاں پہنچ گئے۔ دونوں دوست بے حد مسرت سے بغلگیر ہوئے اور گفت وشنید کے پھول بکھیرنے لگے۔ رات کے گیارہ بجے تک ہم وہیں بیٹھے رہے۔

صبح میرے پاس اسلامیہ کالج کے چند طلبا آئے اور کہنے لگے سالک صاحب حُسنِ اتفاق سے مولانا گرامی آئے ہوئے ہیں۔ بے شمار لوگ ان کا کلام سننے کے مشتاق ہیں۔ اگر آپ کسی طرح مولانا کو آمادہ کر لیجئے تو ہم حبیبیہ ہال میں ایک خاص اجتماع کا انتظام کئے لیتے ہیں۔ خدا جانے یا قسمت یا نصیب۔ اب کبھی مولانا لاہور میں آسکیں گے یا نہیں۔ ان کی زبانی چند اشعار تو سن لیں۔ مَیں مولانا کی ضدی طبیعت کو جانتا تھا۔ مَیں نے طلبا سے کہا کہ تم جالندھر ایسوسی ایشن اسلامیہ کالج" بن جاؤ۔ اور میرے ساتھ چلو۔ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچکر مَیں نے مولانا سے عرض کیا کہ آج دوپہر کو آپ حبیبیہ ہال میں کلام سنائیں گے۔ کیونکہ وہاں طلبا نے جلسے کا انتظام کیا ہے۔ حسبِ توقع مولانا نے انکار کر دیا اور پیری اور تکان کا عُذر کیا۔ اس پر مَیں نے اپنا حربہ استعمال کیا اور کہا۔ مولانا یہ لڑکے جالندھر کے ہیں۔ انہوں نے اسلامیہ کالج میں جالندھر ایسوسی ایشن قائم کر رکھی ہے۔ اور ہمیشہ اپنے ہمسروں میں ڈینگیں مارتے رہتے ہیں کہ آج ہمارے شاعر کا جواب نہیں گرامی آئیں گے تو ہم تم کو ان کا کلام سنوائیں گے اب اگر آپ تشریف نہ لے گئے تو جالندھر کے ان نوجوانوں کی بڑی ذلت ہوگی۔

(حالانکہ ان میں سے ایک بھی جالندھر کا نہ تھا)

جلیبیہ ہال میں

مولانا موم ہو گئے " اچھا؛ یہ بچے جالندھر کے ہیں؛ پھر تو میں ضرور آؤں گا سالک صاحب۔ آپ کی ڈیوٹی ہے۔ آپ مجھے ساتھ لے کر جائیں گے۔ عرض کیا مولانا بسر و چشم۔ چنانچہ طلبا نے جلیبیہ ہال میں فرش فروش کا انتظام کر کے سٹیج بنا دیا مولانا گرامی سٹیج پر تشریف فرما ہوئے۔ حقہ لگا دیا گیا اور باہر جلسہ انجمن میں اعلان کر دیا گیا کہ جلسے کے خاتمہ پر مولانا گرامی جلیبیہ ہال میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ ارباب ذوق وہاں تشریف لائیں۔ جب ہال بھر گیا تو میں نے مولانا سے کلام کی فرمائش کی کہنے لگے۔ نہیں پہلے اور لوگ پڑھیں۔ میں بے حد پریشان ہوا کہ اب شعراء کو کہاں سے لاؤں۔ اتنے میں منشی میراں بخش جلوہ سیالکوٹی نظر آئے۔ یہ ایک بلند قامت، سیاہ فام ڈاڑھی اور بگڑی آور لمبے کالے چغے والے شاعر تھے۔ پرانے فیشن کے اور بے تکے شعر کہا کرتے تھے اور انجمن کے جلسے میں اکثر آتے تھے۔ میں نے ان سے فرمائش کی مولانا حقے کی نے منہ میں لئے کرسی پر بیٹھے تھے۔ جلوہ نے ایک غزل سنائی۔ جس کی زمین تھی۔ سحر کی آستیں۔ قمر کی آستیں۔ جب مقطع پڑھا ؎

یار کا جلوہ جو دیکھا اڑ گئے درزی کے ہوش
آستیں کی کی کمر اور کی کمر کی آستیں!

تو مولانا ایک دم کیا فرماتے ہیں " واہ رے تیری کی کی کی"، قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔ اور جلوہ صاحب بہت مدھم ہوئے۔

اس کے بعد حفیظ جالندھری نے ایک نظم سنائی۔ پھر مولانا نے مجھ سے باصرار ایک فارسی غزل کی فرمائش کی جو مَیں نے پڑھ کر سنائی اور مولانا سے عرض کیا کہ اب اور کوئی نہیں۔ آپ ہی کی باری ہے۔ اس پر مولانا نے کوئی ایک گھنٹے تک اپنا کلام بلاغت نظام سنایا۔

جب یہ جلسہ ختم ہوا تو مولانا شاعری کے آسمان سے اتر کر پھر اپنی عام سطح پر آ گئے۔ مَیں نے سیّد احمد شاہ بخاری کا تعارف کرایا۔ کہنے لگے۔ اچھا! تو یہ بخارا کے رہنے والے ہیں؟ پھر یہ تو ہماری غلطیاں نکالتے ہوں گے۔ بخاری یہ سن کر کسی قدر خفیف ہوتے۔ پھر مَیں نے سیّد امتیاز علی تاج کو پیش کیا۔ اچھا! تو یہ مولوی ممتاز علی صاحب کے صاحبزادے ہیں؟ مولوی صاحب ہمارے پرانے دوست ہیں۔ یہ کہہ کر امتیاز کے چہرے پر ہاتھ لہرا لہرا کر کہنے لگے۔ واہ بھئی واہ بھئی واہ۔ اس واقعہ کے بعد ہم مدّت تک مولانا کی اس حرکت کو یاد کر کے امتیاز کو چھیڑا کرتے تھے۔

ان تمام بدحواسیوں کے باوجود مولانا گرامی محبّت اور خلوص کے پتلے تھے۔ ڈاکٹر اقبال سے تو خیر۔ پرانی رسم و راہ تھی۔ لیکن مجھ سے اور حفیظ جالندھری سے بھی بے حد محبّت کرتے تھے۔ مرتے وقت بھی ہم تینوں ہی کو یاد کر رہے تھے۔

اللّٰھم اغفرلہٗ

مولانا احمد سعید دہلوی

۱۹۲۲ء کے اواخر میں جب میں مدیر زمیندار کی حیثیت سے تحریکِ خلافت میں سزایاب ہو کر میانوالی جیل میں پہنچا تو چند ہی روز میں معلوم ہو گیا کہ مولانا احمد سعید ناظم جمعیتہ العلمائے ہند بھی اسی جیل کے کسی دوسرے حصّے میں موجود ہیں۔ وارڈروں سے کُرید کُرید کر جو پوچھا تو انکشاف ہوا کہ مولانا قیدیوں کے لباس میں ہیں اور مونج بٹنے کی مشقت کر رہے ہیں۔ یہ سن کر بہت صدمہ ہوا۔ جب دوسرے دن شام کو ڈاکٹر رامجیداس سپرنٹنڈنٹ جیل دریافت حال کے لئے ہمارے وارڈ میں آئے تو مَیں نے اور اختر علی خاں نے ان سے کہا کہ مولانا احمد سعید دہلوی ہمارے نہایت ہی محترم عالمِ دین بلکہ ہندوستان بھر کی جمعیت علماء کے سیکرٹری ہیں اور مسلمانوں میں جمعیتہ علماء، کانگرس اور

مجلسِ خلافت سے کہیں زیادہ اثر ونفوذ رکھتی ہے۔ ایسی شخصیت کو عام قیدیوں کی طرح رکھنا کسی اعتبار سے قرینِ انصاف نہیں۔ ہم درجۂ خاص کے قیدی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی آسائشیں میسّر ہیں۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص اس امر پر آمادہ ہے کہ اس کو درجۂ خاص کی رعایات سے محروم کر کے مولانا کو اس کی جگہ اس درجے میں شامل کر دیا جاتے۔ ڈاکٹر رامجید اس نے کہا کہ حکومت کی طرف سے مولانا کے متعلق کوئی ہدایات موصول نہیں ہوئیں۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ مولانا کو بھی سپشیل کلاس دے دی جائے۔

مولانا کا ورُود

چند روز بعد مولانا احمد سعید ہمارے وارڈ میں تشریف لائے اور مجھے پہلی دفعہ اسی دن نیاز حاصل ہوا۔ عام قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بشّاش بشرہ۔ چھدری سی ڈاڑھی۔ توند کسی قدر نکلی ہوئی۔ بلند قامت۔ آنکھوں میں شفقت اور شوخی کا عجیب سا امتزاج۔ بات بات پر قہقہے لگاتے اور جیل کے لطیفے سنا کر ہمیں ہنساتے رہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا کو سپیشل کلاس مل گئی ہے اور وہ مستقل طور پر ہمارے وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ بے حد خوشی ہوئی۔ مولانا نے غُسل کر کے اپنا اصلی لباس پہنا۔ سر پر دہلی وال کڑھی ہوئی ٹوپی۔ شیروانی اور آڑا پاجامہ۔ چونکہ وہ ہم سب میں بزرگ اور واجب الاحترام تھے اور ان کی شخصیت میں جاذبیت بدرجۂ اتم تھی۔ اس لئے ہم دن بھر انہی کے گرد جمع رہتے تھے۔

درس و تدریس

کچھ مدت کے بعد جب میانوالی جیل میں قیدیوں کی ایک اور بڑی کھیپ آن پہنچی تو ہم لوگ ایک چھوٹے وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے جو معمولاً قید محض کے اسیروں اور کم عمر قیدیوں کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن اب بلا امتیاز سالک۔ سیماب۔ اختر علیخاں صوفی اقبال۔ مولوی لقاء اللہ۔ مولانا احمد سعید۔ مولانا داؤد غزنوی۔ عبدالعزیز انصاری سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ اس وارڈ میں یکجا کر دیئے گئے اور یہاں ہماری زندگی کا ایک خاص انداز شروع ہوا۔ مَیں نے اور عبدالعزیز انصاری نے مولانا احمد سعید سے عربی۔ صرف و نحو۔ ادب اور منطق کا سبق لینا شروع کیا۔ ایک آدھ گھنٹہ پڑھ لیتے۔ پھر ایک دو گھنٹے آموختہ دہراتے۔ اور اُردو سے عربی میں ترجمہ کر کے مولانا کو دکھاتے۔ مولانا کا اندازِ تدریس اگرچہ وہی اساتذۂ قدیم کا سا تھا۔ لیکن وہ اس میں خاص دلآویزی پیدا کر دیتے تھے جس میں بیزاری ناگواری کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ اور ہم بے تکان کتابیں پڑھتے چلے جاتے تھے۔

اک بارہ ہے کہ دوبارہ

جیل کی دنیا عجیب دنیا ہے وہاں قیدیوں کو بیرونی دنیا کے واقعات و حوادث کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ خصوصاً عام اخلاقی قیدی تو اپنی جہالت کی وجہ سے بالکل ہی بے خبر ہوتے ہیں۔ قیدیوں کی دو قسمیں ہیں۔ "اک بارہ" اور "دوبارہ" جن کو انگریزی میں (CASUAL) اور (HABITUAL) کہتے ہیں۔ اکبارہ وہ قیدی ہے

جس کو پہلی مرتبہ جیل میں آنے کا اتفاق ہوا ہو۔ دوبارہ وہ جو عادی مجرم ہو۔ اور ایک سے زیادہ بار قید ہو چکا ہو۔ مولانا نے لطیفہ سنایا کہ جب میں نیا نیا میانوالی جیل میں آیا۔ تو ایک پرانے اور طویل المیعاد قیدی نے مجھے نماز و تلاوت میں مصروف دیکھ کر سمجھ لیا کہ مولوی ہوں۔ ایک دن اس نے پوچھا۔ "مولبی جی۔ تم نے کیا جرم کیا تھا۔ کہ بندھ گئے"؟ مَیں نے کہا۔ بھئی۔ ہم تو تحریک خلافت میں سزایاب ہو کر آتے ہیں۔ قیدی کچھ نہ سمجھا۔ پھر مَیں نے اس کو ترک موالات۔ عدم تعاون۔ نا بل ورتن اور خدا جانے کس کس لفظ اور اصطلاح کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی۔ نتیجہ صفر مَیں نے پوچھا۔ "گاندھی کو جانتے ہو"؟ کہنے لگا ہاں۔ ہمارے گاؤں میں ایک گاندھی ہے جو شادی بیاہ کے موقعہ پر عطر لگایا کرتا ہے (یعنی گندھی) آخر مَیں نے عاجز آکر کہا۔ "خلیفۃ المسلمین" کو جانتے ہو؟ قیدی نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا کہ وہ اکبارہ ہے کہ دوبارہ؟ مَیں بے اختیار ہنس دیا اور تفہیم کی کوشش سے دست بردار ہو گیا۔

شیخِ مجلس

مولانا احمد سعید ایک عالی پایہ عالم دین اور شیوا بیان خطیب ہونے کے باوجود یبوستِ طبع اور تعبس سے بالکل خالی تھے اور ہم نوجوانوں میں بیٹھ کر دن بھر لطیفہ بازی کیا کرتے تھے بلکہ جب ہم لوگ رات کو وقت گزاری اور تفریح کے لیے قوالی کرتے تو مولانا اس میں شیخ مجلس کی حیثیت سے متمکن ہوتے۔ اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری بعض اوقات "حال کھیلتے کھیلتے" مولانا کی توند پر جا پڑتے۔ مولانا ہنستے بھی جاتے اور بُرا بھلا بھی کہتے جاتے۔ ایک دفعہ ہم نے مولانا کو ایک گیت سنانے

پر بھی مجبور کر لیا۔ مولانا نے بہت مزے لے لے کر گیت گایا۔ وہ گیت کیا تھا کبھی وقت تخلیہ میں سید عطا اللہ شاہ بخاری سے سن لیجئے۔ انہیں ضرور یاد ہوگا۔

ڈاڑھی کا مسئلہ اور علمائے مصر

مولانا سے اکثر دینی مسائل پر مذاکرات بھی ہوتے اور وہ اپنے علم و فضل اور بیان کے سلجھاؤ کی وجہ سے دقیق سے دقیق چیز کو بآسانی سننے والوں کے ذہن نشین کر دیتے۔ ایک دفعہ ڈاڑھی کے مسئلہ پر بات چیت ہوئی۔ مولانا نے اپنا مسلک واضح کیا اور حدیث رسولؐ "قصوا الشوارب واعفوا اللحیٰ" کو دلیل میں پیش کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فرمانے لگے کہ دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کے علماء اس معاملے میں اتنے شدید و متشدّد نہیں ہیں۔ جتنے ہمارے علماء ہیں۔ پھر فرمایا میں چند ماہ پیشتر مصر گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ نماز کے لئے ایک مسجد میں گیا۔ ابھی وضو ہی کر رہا تھا کہ محسوس کیا بعض لوگ بڑے غور سے مجھے گھور رہے ہیں۔ سوچا کہ غیر ملکی ہوں اس لئے دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن ایک دو منٹ کے بعد ہی ایک پوچھ بیٹھا انتَ یہودی؟ میں نے جواب دیا۔ لا واللہ انا مسلم الحمد للہ پھر اس نے کہا کہ تمہاری پھیلی ہوئی اور غیر مُرتّب ڈاڑھی بالکل یہودیوں کی سی ہے یہ دُرست نہیں۔ من تشبہ بقوم فھو منھم قرآن مجید کہتا ہے کہ جو شخص کسی قوم سے تشبّہ کرتا ہے وہ اسی قوم میں سے ہے۔ میں یہ سن کر بے حد پریشان ہوا کہ ہم تو ہندوستان میں ڈاڑھی منڈانے والوں کو یہ آیت سنایا کرتے ہیں۔ یہاں اُلٹا یہی آیت ہماری ڈاڑھیوں پر منطبق کی جا رہی ہے۔

نماز پڑھنے کے بعد میں سیدھا جامعہ از ہر چلا گیا کیونکہ حضرت شیخ الازہر سے ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ جامعہ کے اندر جا کر جس کرے میں جھانکتا ہوں یہی نظر آتا ہے کہ ایک فرنچ کٹ یا خشخشی داڑھے والے معلم طلبہ کے سامنے کھڑے ہیں اور حدیث بخاری پر لیکچر دے رہے ہیں۔ ایک قریب قریب داڑھی منڈا آدمی فقہ حنفیہ کے غوامض و نکات نہایت فصیح و بلیغ عربی میں بیان کر رہا ہے۔ خیر۔ جب میں رہبر کی مدد سے حضرت شیخ الازہر کے فیشنیبل ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ان کے چہرے پر میں نے پوری داڑھی دیکھی۔ علیک سلیک کے بعد پہلے تو مسئلہ خلافت اور سیاسیات عالم اسلامی پر گفتگو جاری رہی۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔ حضرت داڑھی کے متعلق آپ لوگوں کا مسلک کیا ہے۔ میں نے تو یہاں آکر دیکھا کہ رسول اللہ کی اس سنت پر بہت ہی کم عمل ہوتا ہے اور خود علما بھی اس کے تارک ہیں۔

واجب نہیں مستحب

شیخ الازہر مسکراتے اور کہا۔ ہندوستان میں لوگ اس قسم کے غیر اہم مسائل پر تضیع اوقات کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اوضاع ظاہری کا معاملہ امور شرعیہ میں شامل نہیں ہے میں نے گزارش کی کہ آپ بھی تو فقہ حنفی پر عامل ہیں۔ اصول فقہ میں ہے۔ الامر للوجوب خدا اور رسولؐ نے جن امور کے متعلق حکم دیا ہے اس کی تعمیل واجب ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ ہر کلیہ کا استثنا ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اوضاع ظاہری میں یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ ہم اس کو استحباب کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان بہ نیت اتباع رسولؐ داڑھی رکھتا ہے تو اس کو یقیناً ثواب ہوگا۔ اگر منڈاتا یا ترشواتا ہے تو اس پر کوئی عذاب نہ ہوگا

ئیں خود حکم رسولؐ کی تعمیل میں ڈاڑھی رکھتا ہوں اور ثواب کا متوقع ہوں۔ میرے رفقا نہیں رکھتے۔ ئیں انہیں نہ گمراہ سمجھتا ہوں۔ نہ مستوجب عذاب خیال کرتا ہوں۔

جیل میں پان

مولانا احمد سعید دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مدرسے کے رئیس اعلیٰ کی یہ بحث سن کر خاموش ہو گئے اور سلام و دعا کے بعد واپس چلے آئے۔

مولانا احمد سعید پان کھانے کے عادی تھے لیکن جیل میں پان کہاں۔ قریب قریب ہر درجۂ خاص کے قیدی کو اس کے اعزّہ باہر سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ دہلی سے مولانا کی چیزوں میں۔ ایک تھیلا گٹکے کا بھی آیا۔ (پان بنا کر اور چھالیا اور زردہ شامل کر کے سکھا لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کو تھیلے میں بند کر رکھتے ہیں۔ یہ گٹکا کہلاتا ہے) جس کی ایک آدھ چٹکی کھانا کھانے کے بعد مجھے بھی مل جایا کرتی تھی اور پان کھانے کی طلب کسی حد تک پوری ہو جاتی تھی۔

طبّاخی میں کمال

دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے بھی ہمارے ہی وارڈ میں آ گئے تھے۔ اور ہمارے باورچی خانے کے انچارج تھے لیکن ان کے آنے سے پہلے پخت طعام کی نگرانی ہم نے مولانا احمد سعید کو سپرد کر رکھی تھی۔ کیونکہ وہ اس معاملے میں بڑے ماہر تھے اور ہمیشہ اپنے کمالاتِ طباخی کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔ وہ ہم سب سے پہلے اپنی یک سالہ میعادِ قید ختم کر کے رہا ہو گئے۔ ہماری مجلس شیخ مجلس کے جانے کے بعد

سونی ہوگئی اور میری اور عبدالعزیز انصاری کی تعلیم عربی بھی ادھوری رہ گئی۔

دلکش خطابت

عام گفتگو میں مولانا کا انداز بیان نہایت دلکش۔ معصومانہ اور خندہ آور تھا۔ اور ان کے پاس بیٹھنے والے گھنٹوں ان کی باتیں سنتے اور اُکتاہٹ کے بجائے دمبدم دلچسپی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا۔ یہی حالت خطابت و تقریر کی تھی۔ مولانا نہایت ٹھیٹھ دہلوی روزمرے میں جس میں کرخنداروں کے مخصوص محاورات کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ گھنٹوں تقریر فرماتے اور ہزارہا کا مجمع نقش بدیوار ہوکر ان کے ارشادات سنتا رہتا۔ جہاں کہیں ان کے وعظ کا اعلان ہوتا۔ خلقت ہر طرف سے ٹوٹ پڑتی۔ میں عمر بھر بہت ہی کم جلسوں میں شامل ہوا ہوں لیکن جس زمانے میں اہلِ بدعت نے سلطان ابنِ سعود کے خلاف ملک میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اور یہ الزام عاید کیا تھا کہ وہابی سپاہیوں نے روضہ اطہر پر گولیاں چلائی ہیں۔ اس فتنے کو فرو کرنے کے لئے مولانا محمد علی اور مولانا احمد سعید دہلی سے لاہور تشریف لاتے تو میں صرف مولانا احمد سعید کی تقریر سننے کے لئے باغ بیرون دہلی دروازے کے عظیم الشّان جلسے میں شامل ہوا۔ اور مولانا کی شیوا بیانی کی یاد اب تک اپنے دماغ میں محفوظ پاتا ہوں۔

تصانیف

مولانا کے کمالات صرف تقریر تک محدود نہیں ہیں بلکہ آپ نے متعدّد سلیس و مفید کتابیں بھی لکھی ہیں۔ دوزخ کا کھٹکا۔ جنّت کی کنجی۔ رسولؐ کی باتیں۔ مضامین احمد سعید

تقاریر احمد سعید۔ شوکت آرا بیگم اور متعدد دیگر رسائل جو چھپ کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ اگرچہ مولانا کی عمر اسّی سال کے قریب ہو چکی ہے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا شغلہ برابر جاری ہے۔ آج کلؒ عام فہم اردوؒ میں تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں۔ جس کی چند سورتیں شائع ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کی مہلت عطا فرماتے۔

آپ نے تقسیم کے بعد انتہائی ابتلاؤ آزمائش کے کوائف کے باوجود دہلی ہی میں مقیم رہنا پسند فرمایا۔ اور وہیں مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہوتے۔ مجھے تقسیم کے بعد دو دفعہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ دونوں موقعوں پر مَیں حصول نیاز کے لئے حاضر خدمت ہوا۔ حسب عادت نہایت محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے۔ پہلی دفعہ پنڈت رام ناتھ (سابق مینجر انقلاب) ساتھ تھے۔ دوسری بار پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی معیت میں حاضر ہوا۔ کہن سالی کے باوجود مولانا کی صحت بہت اچھی ہے۔ چہرے پر بدستور سرخی اور بشاشت کا نور نمایاں ہے۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی کی شخصیت اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے پورے برِصغیر میں مثال نہ رکھتی تھی۔ وہ حضرت نظام الدینؒ اولیا کے خاندان سے متعلق تھے ان کی ابتدائی عمر ناداری اور کس مپرسی میں بسر ہوئی۔ لیکن طبیعت کی سادگی۔ ہمّت کی بلندی اور عدیم المثال جفاکشی کے باعث وہ اس ناداری میں بھی خوش و خرّم رہتے تھے۔ کتابوں کا گٹھا اٹھا کر کوچہ و بازار میں فروخت کر کے معاش پیدا کرتے تھے۔ لیکن دفعتہً مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُردو کے ایک صاحبِ طرز انشا پرداز بن گئے۔ ان کی تحریر سادگی اور البیلے پن کا مرقع تھی۔ پیش پا اُفتادہ موضوع کو لے کر اس میں اپنی جودت طبع اور جدّتِ فکر سے جان ڈال دیتے۔ خصوصاً عوام کے

لیتے ان کے مضامین میں بڑی کشش تھی۔ کیونکہ وہ انہیں آسانی سے سمجھ بھی لیتے تھے اور متاثر بھی ہوتے تھے۔ ادب و انشا کی شہرت کے ساتھ ہی ساتھ ان کے یاران طریقت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا اور ملک کے مختلف حصّوں میں ان کے مریدوں کی تعداد ساٹھ ستر ہزار سے بھی متجاوز ہو گئی۔ ان کی چھوٹی بڑی کُل تصانیف ملاکر دو سو سے زیادہ ہوں گی۔ جن کے ایڈیشن دھڑا دھڑ فروخت ہوتے تھے اور خواجہ صاحب کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ انہوں نے بیسیوں رسالے۔ ہفتہ وار اخبار اور روزنامے جاری کئے اور بند کئے۔ نظام المشائخ توحید۔ عادل۔ منادی اور خدا جانے اور کون کون سے پرچے ان کے فیض تحریر سے مقبول عام ہوتے۔ جن میں سے ایک منادیؔ آخر تک جاری رہا۔ جس میں خواجہ صاحب اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ اس روزنامچے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فُقرا و مساکین سے لیکر اُمرا و سلاطین اور حکام اعلیٰ تک۔ ہندوستانیوں سے لے کر یورپینوں تک ہندو۔ مسلمان۔ یہودی۔ عیسائی۔ سکھ۔ پارسی۔ غرض ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے خواجہ صاحب کے مخلصانہ تعلقات تھے۔

غدرِ دہلی کے افسانے

خواجہ صاحب کی کتابیں تو بے شمار ہیں لیکن سب سے زیادہ دلآویز اور موثّر اور پُردرد "غدرِ دہلی کے افسانے" ہیں جو خواجہ صاحب نے دہلی کے بڑے بُوڑھوں اور بڑی بوڑھیوں سے باتیں کرنے کے بعد اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں لکھے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے وہ تمام مصائب نظروں کے سامنے آجاتے ہیں جو

۵۷ء کے ہنگامے میں اور اس کے بعد مغلوں کے آخری بادشاہ اس کے اعزّہ و متوسّلین اور عام مسلم معاشرے کو پیش آئے۔ اگر خواجہ صاحب اس کتاب کے سوا اور کچھ بھی نہ لکھتے۔ جب بھی وہ اُردو کے بے مثال انشا۔ پرداز تسلیم کرلیے جاتے۔

خصائل و شمائل

بلند قامت۔ دبلے پتلے آدمی تھے۔ بھری سی ڈاڑھی۔ سر پر درویشوں کی سی نکیلی ٹوپی۔ بَر میں لمبا کرتہ اور لمبا فرغل۔ ٹانگوں میں ایک بر کا کھلا پاجامہ پہنتے۔ چہرے کا رنگ کھُلتا ہوا گندمی۔ آنکھیں چمکیلی اور سخن گو۔ بشرے پر شرافت و شفقت اور خلوص و دردمندی کا اثر ہویدا تھا۔ تقریر و تحریر دونوں عام فہم۔ سادہ اور نکتہ طرازانہ درگاہ خواجہ نظام الدینؒ کے پاس اپنے سیدھے سادے مکان میں فرش پر تکیہ لگا کر بیٹھتے اور دنیا بھر کے معزّز سے معزّز اور فرنگی مآب ملاقاتیوں کو بھی اس فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنا پڑتا۔ پان بہت کھاتے تھے۔ خاصدان اور اُگال دان ہمیشہ پاس دھرے رہتے۔ طبیعت میں خشکی کا نام نہ تھا۔ مزاح و تفنّن کی داد دیتے۔ لیکن کبھی قہقہہ مار کر نہ ہنستے۔ لبوں پر صرف ہلکا سا تبسّم نمودار ہوتا۔

پہلی ملاقات

خواجہ صاحب سے میری پہلی ملاقات دارالاشاعت میں ہوئی۔ جب خواجہ صاحب مولوی سید ممتاز علی سے ملنے آتے۔ مَیں اور امتیاز علی تاج خواجہ صاحب کی تحریروں کے بے حد مدّاح تھے۔ ہم دونوں نے عقیدت مندانہ ان کا نیاز حاصل کیا۔ ان دنوں

مَیں نے ٹیگور کے ڈرامے چترا کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کے جستہ جستہ مقامات خواجہ صاحب نے سنے۔ قدر افزائی فرمائی اور کہا کہ مَیں اس پر دیباچہ لکھوں گا۔ چنانچہ خواجہ صاحب کا لکھا ہوا دیباچہ شاملِ کتاب ہے۔

"چونی"

سنہ ۱۹۲۳ء کے آغاز میں امتیاز نے مجھ سے ذکر کیا کہ بھارت بیاکل تھیٹریکل کمپنی کے ایک نوعمر ایکٹر چونی لال پر خواجہ صاحب کی خاص نظرِ عنایت ہے اور وہ اس کی روشن پیشانی میں شاہدِ ازل کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ مجھے شوخی جو سُوجھی تو مَیں نے پُرسشِ مزاج کے عنوان سے تین چار اشعار فارسی میں لکھ کر "گمنام" کی طرف سے خواجہ صاحب کو ڈاک میں بھیج دیئے۔ جن میں سے صرف تین یاد رہ گئے ہیں ؎

اے خواجۂ نامدار چونی
در صحبتِ گلعذار چونی
من در ہجرِ تو ایں چنینم
تو در پہلوئے یار چونی
در حسرتِ قربِ ذاتِ بیچوں
اے صوفیٔ ہرزہ کار چونی

کچھ مدت بعد جب خواجہ صاحب لاہور آئے اور دفترِ زمیندار میں ملاقات ہوئی۔ تو دورانِ گفتگو میں مَیں نے پوچھا۔ حضرت خواجہ صاحب۔ وہ چونی لال آجکل کہاں ہے۔ یہ سن کر نہایت غور سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "اچھا۔ تو یہ آپ تھے"

تبلیغِ اسلام

جب یوپی میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بلند ہوتے۔ آریہ سماجیوں نے ملکانہ راجپوتوں کو شدھ کرنا شروع کیا اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں تبلیغ اسلام اور انسدادِ ارتداد کی تحریک برپا ہوئی۔ تو خواجہ صاحب نے اپنے انداز میں تبلیغ اسلام کی کامیابی کی تدبیریں بتانی شروع کیں۔ ایک پمفلٹ شائع ہوا۔ جس میں دوسری تدبیروں کے علاوہ ایک یہ تدبیر بھی بتائی کہ طوائفیں جو اکثر مسلمان ہیں اپنے ہاں آنے والوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کریں۔ اس پر ہندو اخباروں نے مسلمانوں اور ان کے مبلغوں پر بے پناہ حملے کئے اور مسلمان حلقوں میں بھی خواجہ صاحب کی اس مجوّزہ تدبیر کی ہنسی اڑائی گئی۔

رئیس الاحرار سے چخ

جن دنوں مولانا محمد علی دہلی سے اپنا روزنامہ "ہمدرد" نکالتے تھے۔ انہیں کہیں سے معلوم ہوا کہ خواجہ حسن نظامی نے چیف کمشنر دہلی سے مولانا کی شکایت کی ہے اور ان کی گرفتاری کا مشورہ دیا ہے۔ خدا جانے اس افواہ میں کوئی حقیقت بھی تھی یا نہیں۔ لیکن مولانا محمد علی کی جنگجوئی نے خواجہ صاحب کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ قائم کر لیا۔ اور ہمدرد میں ختمِ خواجگی کے عنوان سے خواجہ صاحب کے خلاف پے در پے افتتاحیے لکھنے شروع کر دیئے —— پہلے تو خواجہ صاحب طرح دیتے رہے لیکن جب رئیس الاحرار کا غصہ کسی طور سے فرو نہ ہوا تو انہوں نے "غریبوں کا اخبار" نکال کر

مولانا پر تابڑ توڑ حملے کئے اور منادی میں بھی لکھنے لگے۔ ادھر یار لوگوں نے منادی کے مقابلے میں "سنادی" نکلا۔ دوسری طرف سے "اڑادی" نکلا۔ غرض دو تین مہینے تک خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی اور دونوں انشا پردازوں کے جوہر کھُلے۔ آخر حکیم اجمل خاں اور بعض دوسرے سنجیدہ حضرات کی مساعی مصالحت سے یہ ہنگامہ فرو ہو گیا۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ قوّتِ تحریر میں مولانا محمد علی اور عام پسند نشر و اشاعت کی وسعت کے اعتبار سے خواجہ صاحب کامیاب رہے اور یہ کشتی برابر سرا بر چھُڑا دی گئی۔

جھٹکۃ المشائخ

۱۹۳۳ء میں میری بڑی بیٹی کی شادی پر جہاں مقامی اکابر نے تشریف لا کر مجھے عزت بخشی وہاں خواجہ صاحب دہلی سے آ کر شریک ہوئے اور مجھے بندۂ احسان بنا لیا میرا معاملہ خواجہ صاحب کے ساتھ اسی قسم کا تھا کہ چوٹیں بھی چلتی رہتی تھیں اور نیاز مندی بھی پورے خلوص سے جاری رہتی۔ چنانچہ انہی دنوں جب خواجہ صاحب نے اپنے اخبار میں جھٹکے کے گوشت کو حلال بتایا تو مَیں نے "افکار و حوادث" میں دہلی کے "حضرت جھٹکۃ المشائخ" کو خاصا رگڑا دیا۔ اتفاق کی بات انہی دنوں مہاراجہ صاحب کپور تھلہ کی بنائی ہوئی مسجد مکمل ہوئی تھی۔ اور مجھے مہاراجہ نے اس کے افتتاح کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے رکھی تھی۔ مَیں کپور تھلہ گیا تو معلوم ہوا کہ مہاراج کے محل کی وسیع گراؤنڈ میں مہمانوں کے لئے بہت سے خیمے نصب ہیں۔ مَیں ان خیموں کے درمیان سیر کر رہا تھا کہ کسی نے بتایا کہ وہ خواجہ حسن نظامی کا خیمہ ہے۔ اگرچہ "افکار" کی اشاعت کے باعث میری طبیعت میں ایک خفیف سا حجاب تھا۔ لیکن مَیں جُوں تُوں کر کے خواجہ صاحب

کے خیمے میں داخل ہو ہی گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک تپائی کے گرد چند کرسیوں پر بعض حکام ریاست بیٹھے ہیں۔ سامنے خواجہ صاحب رونق افروز ہیں اور تپائی پر "انقلاب" کا وہی پرچہ پڑا ہے۔ جس میں خواجہ صاحب کو مسخرۃ المشائخ کا خطاب دیا گیا تھا۔

متانت اور عمر کا تعلق

خواجہ صاحب مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ بہت تپاک سے گلے ملے۔ مزاج پرسی کے بعد ابتدائی باتیں ختم ہوئیں تو خواجہ صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔ "سالک صاحب آپ بڑے نکتہ رس آدمی ہیں۔ بھلا یہ تو بتایئے انسان میں متانت کس عمر میں آجاتی ہے؟" (میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر چوٹ ہے کہ تمہاری عمر ۳۰ برس کی ہونے کو آئی لیکن اب تک غیر متین ہو) میں نے نہایت سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ "حضرت بات یہ ہے کہ متانت اور عمر کا تعلق کچھ اعتباری سا ہے۔ بعض لوگ پیدائشی متین ہوتے ہیں۔ لیکن بعض صوفیہ کرام تک کو دیکھا ہے کہ پچاس پچاس برس کے ہو گئے لیکن رہے وہی مسخرے کے مسخرے ـــــ محفل کی خاموشی ٹوٹ گئی۔ ایک عام قہقہہ بلند ہوا۔ جس میں خواجہ صاحب نے بھی سر ہلا کر اور مسکرا کر حصہ لیا اور نکتہ رسی کی داد دی۔

ایمان خانہ اور مقامات

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں ریڈیو پر تقریر کرنے کے لئے دہلی گیا ہوا تھا۔ جب خواجہ صاحب کی زیارت کے لئے نظام الدین حاضر ہوا تو بڑے تپاک سے ملے۔ اس وقت کرنل مقبول حسین قریشی (بہاولپور) بھی موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ صاحب

مجھے ساتھ لے کر درگاہ دکھانے کے لئے چلے۔ خواجہ صاحب کے گھر سے ایک زینے پر چڑھ کر دوسری طرف اُترے تو یہ ایک معمولی سا کمرہ تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا یہ ایمان خانہ ہے۔ مَیں نے کہا اسی پر کیا موقُوف ہے۔ اس نواح کے تو سبھی مکان ایمان خانے ہیں۔ ہم جہاں سے اُٹھ کر آئے ہیں کیا وہ "بے ایمان خانہ" تھا؟ ہنس دیئے اور کہنے لگے۔ آپ "افکار" لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہیں۔ اس کے بعد ایک کمرے میں چند طاق دکھائے۔ جن میں سے کسی پر مقام آدمؑ۔ کسی پر مقام موسٰیؑ کبھی پر مقام ابراہیمؑ لکھا تھا۔ ایک مقام خالی تھا۔ مَیں نے پوچھا۔ یہ کیا ہے کہنے لگے یہ مَیں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے مَیں نے کہا کہ اس پر لکھ دیجئے مقام محصوص یہ سن کر بہت شگفتہ ہوئے اور کہنے لگے۔ اب آپ درگاہِ خواجہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لئے تفنّن برطرف۔ چنانچہ مَیں نے فاتحہ پڑھی اور رخصت ہوا۔

حسرت خواجہ صاحب کی خدمت میں

اس کے بعد جب ایک دفعہ مَیں دہلی گیا تو ان دنوں چراغ حسن حسرت ریڈیو (دہلی) میں ملازم تھے۔ وہ کہنے لگے۔ سالک صاحب۔ مَیں کبھی خواجہ حسن نظامی سے نہیں ملا۔ اگر آپ اُن کی طرف جائیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلئے گا۔ مَیں نے دوسرے ہی دن صبح احمد شاہ بخاری کی موٹر کار میں حسرؔت کو بٹھا کر نظام الدّین کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچے۔ مَیں نے حسرت کا تعارُف کرایا۔ حسرت خواجہ صاحب کی خدمت میں مؤدّبانہ بیٹھے اور پہلی ملاقات کی وجہ سے تکلّف فرما رہے تھے۔ ایک صوفی صافی اور پیر طریقت کی محفل۔ آس پاس عقیدت مند سر جھکائے ہوئے۔ حسرؔت صاحب

مسلسل سگریٹ پینے والے بار بار اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے جاتے اور کچھ سوچ کر رہ جاتے۔ مَیں نے دیکھا کہ حسرت سگریٹ نہ پینے کی وجہ سے بہت مضطرب ہیں۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب نے کسی بیماری کی وجہ سے اپنے لمبے لمبے گیسو ترشوا دیئے تھے۔ مَیں نے حسرت سے کہا "حسرت صاحب۔ آپ شوق سے سگریٹ پیجئے۔ اب تو خواجہ صاحب کیس کٹوا چکے ہیں۔ خواجہ صاحب نے داد دی۔ اور حسرت نے شگفتہ ہو کر اپنا سگریٹ کیس جیب سے نکال لیا اور کش پہ کش لگانے لگے۔

آخری ملاقات

۱۹۵۳ء میں مَیں ایک مشاعرے کے سلسلے میں دہلی گیا۔ ارادہ تھا کہ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضری دوں۔ خواجہ صاحب بیمار تھے۔ اس لئے عیادت بھی ضروری تھی۔ لیکن ابھی میں ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اخبار نویسوں کی ایک پارٹی میں جانے کا اتّفاق ہوا۔ جہاں خواجہ صاحب کو رونق افروز پا کر مجھے تعجّب ہوا۔ مَیں بغلگیر ہوا اور عرض کی "حضرت۔ آپ تو بالکل فریش بستر علالت تھے آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ کہنے لگے مَیں نے سنا تھا۔ سالک صاحب آتے ہیں۔ مَیں نے کہا یا قسمت یا نصیب۔ پھر یکجائی کا موقع ملے یا نہ ملے۔ اس لئے دو تین دوستوں کا سہارا لیکر موٹر کار سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ خواجہ صاحب بے حد لاغر و نحیف ہو رہے تھے۔ مَیں دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ کہنے لگے۔ نہیں نہیں اب مَیں اچھا ہوں اور اچھا نہ بھی ہوں گا تو ایک دن مولا کے دربار میں حاضر ہونا ہی ہے۔ اس میں رنج کی کیا بات ہے۔ اس دن خواجہ صاحب نے مجھ سے بہت ہی گھل مل کر باتیں کیں اور پُرانے

پُرانے واقعات یاد کرتے رہے۔ دل میں کھٹکا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اس کے بعد نہ خواجہ صاحب پاکستان آ سکے نہ مَیں دہلی جا سکا۔

ہندوستان میں مسلمان یوں بھی مشتبہ ہیں اور اُردو زبان کی حوصلہ افزائی کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔ پاکستان میں بے حسی عام ہے اور ہندوستانی شہریوں سے بیگانگی برتی جاتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی جیسے عالی پایہ اور جلیل القدر ادیب۔ انشا پرداز۔ صحافی۔ شیخ اور عالم کے انتقال پر دونوں ملکوں کے جرائد و عمائد نے جو اظہارِ افسوس کیا وہ ہرگز اس عظیم شخصیت کے شایانِ شان نہ تھا۔ مختلف مقامات پر بعض اہلِ طریقت نے دعائے مغفرت کی اور بعض ادبی حلقوں نے تعزیت کی قراردادیں منظور کیں اور بس۔ کیا آئندہ ہمارے مایہ ناز علمی و ادبی بزرگوں کا یہی حشر ہوتا رہے گا؟

حکیم فقیر محمد چشتی

۱۹۱۴ء میں جب میں نے اپنے رسالہ "فانوسِ خیال" کے اجرا کے سلسلے میں لاہور کا سفر کیا تو حکیم فقیر محمد چشتی سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں وچھووالی میں آریہ سماج مندر کے قریب ایک بالاخانے میں مطب کرتے تھے۔ اس دن سے جو تعلقات قائم ہوئے وہ حکیم صاحب کے انتقال کے دن تک انتہائی خلوص کے ساتھ روز افزوں ہوتے رہے۔ حکیم صاحب اپنے اخلاق و عادات اور اپنی وضعداری کے اعتبار سے مشرقی تہذیب کا بہترین نمونہ تھے۔ ظاہری وضع و لباس میں بھی جو انداز پہلے دن اختیار کر لیا تھا وہی عمر بھر قائم رہا۔ بالا بلند۔ وجیہہ شکیل اور جامہ زیب آدمی تھے۔ سر پر پشاوری لنگی پشاوریوں ہی کے انداز سے باندھتے تھے۔ سیاہ فراک کوٹ

زیب تن ہوتا۔ کالر نکٹائی لگاتے اور شلوار اور بوٹ پہنتے۔ نہایت خوشنما فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ اس وضع و لباس جہاں کہیں بیٹھتے مجلس آراستہ ہو جاتی۔ لباس کی تیاری میں بے انتہا اہتمام کرتے۔ مثلاً کوٹ کی سلائی کبھی تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ روپے سے کم نہ ہوتی تھی حالانکہ اس زمانے میں عام اُجرت پانچ چھ روپے سے زیادہ نہ تھی۔ آپ کے خاص احباب میر حسین علی (مزنگ) میر سردار حسین رئیس (چونی منڈی) اور خان بہادر میاں سراج الدین (کشمیری بازار) بھی بالکل یہی وضع رکھتے۔ جہاں بیٹھ جاتے مجلس شاندار ہو جاتی۔ ایک دفعہ سیّد احمد شاہ بخاری نے کہا تھا کہ حکیم صاحب لوگوں کو چاہیئے آپ کو اور آپ کے دوستوں کو شادی بیاہ کے موقعوں پر کرایہ دے کر بلا لیا کریں۔ برات خواہ مخواہ معتبر معلوم ہو گی۔

وچھو والی کا بالاخانہ چھوڑ کر وہیں ایک وسیع مکان لے لیا تھا کچھ مدت بعد وہاں سے سوتر منڈی (اندرون لوہاری دروازہ) نواب غلام محبوب سبحانی کی حویلی میں اٹھ آئے۔ پھر یہاں سے اس دن اٹھے۔ جب بارود خانہ میں "شفا منزل" کی عالیشان عمارت بن گئی۔

مشرقیت اور وضعداری

حکیم صاحب عمر بھر خوشحال رہے وہ چاہتے تو اپنے کمروں کو بہترین مغربی انداز میں آراستہ کر سکتے تھے۔ لیکن کرائے کے مکانوں میں کیا۔ اور اپنے مملوکہ مکان میں کیا ان کے ہاں ایشائی طریقے کا فرش لگا رہتا اور قالین بچھے رہتے ایک طرف دیوار کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا ہے۔ سیتل پاٹی پر حکیم صاحب رونق افروز ہیں۔ ان کے آگے

مخصوص اور قیمتی ادویہ کا صندوقچہ رکھا ہے آس پاس لکھنے پڑھنے کا سامان۔ کچھ کتابیں اور اخبار پڑے ہیں۔ بڑے بڑے دولت مند اور سپکوُن پوش لوگ آتے تھے اور اسی فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے تھے۔

آٹھوں گانٹھ کُمیت

حکیم صاحب نہایت حاذق و ماہر طبیب تو تھے ہی۔ لیکن بعض دوسرے کمالات سے بھی بہرہ ور تھے۔ مثلاً اعلیٰ درجے کے خطاط۔ چابکدست مصوّر۔ خوش بیان شاعر۔ زبان دان اور مزاحی انشا پرداز بھی تھے۔ میں ان کو "آٹھوں گانٹھ کُمیت" کی پھبتی کہتا اور وہ کہا کرتے تھے۔ کیا سائیسوں کی زبان بولتے ہو۔ پھبتی اور ضلع جگت میں ان کی مثال دُور دُور نہ تھی۔ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں دہلوی کے شاگرد اور حکیم اجمل خاں کے ہم سبق تھے۔ چند سال دہلی کے طبیّ کالج میں پڑھنے اور ثقات کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے زبان منجھ گئی تھی اور محاورات روزمرہ سے کماحقہٗ واقفیت ہو گئی تھی۔

پھبتیاں

خان بہادر میاں سراج الدین کے ہاں کشمیری بازار کے ایک مکان میں ہر روز شام کے وقت ایک پاکیزہ محفل جمتی۔ جس میں خاص احباب جمع ہوتے اور کبھی کبھی رقص و سرود کا مشغلہ بھی ہوتا۔ یہاں حکیم صاحب کی پھلجھڑیاں خاص سماں پیدا کرتیں۔ بات سے بات پیدا کرتے اور جس کو پھبتیوں کا نشانہ بنا لیتے وہ خدا کی پناہ مانگتا۔ ایک ہم نشین کے سر پر نہایت صاف شفاف ٹنڈی تھی اور سر کے تین اطراف میں بالوں کی ایک جھالر سی

تھی۔ جیسے عام طور پر ٹڑی والوں کے ہُوا کرتی ہے اور یہ صاحب ان بالوں کی تراش خراش سے غافل رہ کر اس جھاڑ کو اور بھی زیادہ نمایاں ہونے کا موقع دے دیتے۔ ایک دن ان کی شامت جو آئے تو وہ حکیم صاحب کو چھیڑ بیٹھے۔ بس پھر کیا تھا۔ حکیم صاحب نے پھبتیوں کا جھاڑ باندھ دیا کہنے لگے پہلے سر پر سے گھگری اتار کے آؤ۔ پھر بات کرو وہ کہنے لگے۔ حکیم جی تم تو سر پر چڑھے آتے ہو۔ جواب دیا۔ ارے تمہارے سر پر چڑھ کر کسی کو پھسلنا ہے! تم تو چکنے گھڑے ہو۔ لیکن مَیں تو بوند نہیں ہوں۔

ایک دفعہ ایک طوائف کے ہاں کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ طوائف بہت خوش مزاج تھی۔ اور حکیم صاحب کے لطائف کی قدرداں۔ چنانچہ یہ وہاں پہنچکر بہت چہکنے لگے۔ ایک سیاہ فام میراسی بیٹھا ہوا اپنی کالی کالی پنڈلی کھجا رہا تھا اور خشکی کی وجہ سے اس کی پنڈلی پر سفید سفید لکیریں پڑ جاتی تھیں۔ حکیم جی نے طوائف سے پوچھا۔ کیا اس لڑکے کو سکول میں بٹھا دیا ہے؟ وہ کہنے لگی۔ نہیں تو۔ فرمانے لگے۔ یہ سلیٹ پنسل لئے سوال نکال رہا تھا۔ مَیں نے کہا شاید مدرسے میں پڑھتا ہے۔ کالی پنڈلیوں پر سفید لکیروں کی یہ پھبتی طوائف کو بہت پسند آئی۔ اتنے میں ایک ملازمہ سامنے آ گئی۔ اس کا رنگ کالا تھا لیکن وہ جالی کا کُرتا پہنے ہوتے تھی۔ حکیم صاحب نے اس کو دیکھ کر کہا۔ یوں نظر آتا ہے جیسے باورچی خانے میں سفیدی کرا رکھی ہو۔

نچو طوائف

ایک دفعہ مَیں اور حکیم صاحب موچی دروازے کے اندر ایک امام باڑے میں میر بہادر حسین آرم لکھنوی کا مرثیہ سننے لگے۔ ابھی مجلس شروع نہ ہوئی تھی اور ایک جانب

برآمدے میں کچھ طوائفیں جمع ہو رہی تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں نجّو تھی۔ کھلا ہوا چمپئی رنگ سر پر ایک سفید ریشمی دوپٹہ جس کے کنارے پر چوڑا نقرئی لپّہ لگا ہوا تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ ڈبیا کا انگور ہے۔ تشبیہہ تام تھی۔ بہت داد دی۔ پھر فرمایا ذرا میری بھی سنو۔ عرض کیا۔ کہیئے۔ فرمایا خمیرہ گاؤ زبان بورقِ نقرۂ پیچیدہ۔ میں اس طبیبانہ تشبیہہ پر پھڑک اٹھا۔

یہی نجّو ایک دن حکیم صاحب کے پاس مطب میں بیٹھی تھی۔ میں جو پہنچا تو حکیم صاحب نے اس سے کہا۔ یہ تمہارے شہر کے بہت بڑے شاعر اور ادیب سالک صاحب ہیں۔ آداب بجالاؤ۔ وہ سرو قد اٹھ کھڑی ہوئی اور جھک کر آداب بجالائی۔ پھر مجھ سے کہا۔ کہ یہ لاہور کی مشہور طوائف نجّو ہیں۔ آپ اس کوچے سے نابلد سہی۔ لیکن نام تو سنا ہی ہوگا۔ میں نے کہا۔ جی ہاں نام تو سنا ہے لیکن نجّو بھلا کیا نام ہوا۔ فرمانے لگے۔ لوگ نجّو نجّو کہہ کر پکارتے ہیں پورا نام تو نجات المومنین ہے!

ایک دفعہ میں اور حکیم صاحب تانگے میں سوار میکلوڈ روڈ پر جا رہے تھے کہ سامنے سے کیتھیڈرل سکول کے بچّوں کی لاری گزری۔ جس میں بہت سے بچے سوار تھے۔ اور ایک بڑھیا بطور نگران ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے کہا حکیم صاحب "ڈبہ اطفال" جا رہا ہے۔ ہنسے اور فرمایا۔ وہ بیچ میں "اُم الصّبیان" بھی بیٹھی ہے۔

ایک دن میں نے کہا۔ حکیم صاحب۔ کئی ذی استطاعت مریض آتے ہیں۔ نسخہ لکھوا کر لے جاتے ہیں اور دیتے دلاتے کچھ بھی نہیں۔ آپ فیس کیوں طلب نہیں کرتے۔ آخر اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہنس کر فرمانے لگے۔ اجی مانگنے کی کیا ضرورت "فقر" کی صورت ہی سوال ہے۔

ایک انگریز کا علاج

حکیم صاحب کے لطیفوں کی دلفریبی نے مجھے اس قدر بے خود کر دیا کہ ان کے کمالات کا ذکر رہ ہی گیا۔ حکیم صاحب کی حذاقت ہر حلقے میں مسلم تھی۔ اگر پنجاب کا کوئی مریض مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے مطب میں جاتا تو وہ یہی فرماتے کہ جب لاہور میں فقیر محمد موجود ہے تو میرے پاس کیوں آتے ہو۔ آپ کی وضعداری ابنائے زمانہ میں بے نظیر تھی۔ جس سے ایک دفعہ تعلق پیدا ہو جاتا اس سے عمر بھر یکساں سلوک کرتے۔ اور جن اشخاص سے ذرا بھی خصوصیت یا ہم مذاقی پیدا ہو جاتی ان سے بھی کبھی علاج کی فیس وصول نہ پاتے اور دوستوں پر جان و مال قربان کرنے میں کبھی دریغ نہ فرماتے۔ غریب مریضوں سے کچھ لینا تو درکنار اکثر انہیں دواخانے سے دوائیں مفت دلوا دیا کرتے۔ آخری ایام میں تو ان کی حذاقت کا شہرہ بالائی طبقے میں بھی ہو گیا تھا اور بڑے بڑے فرنگی مآب امرا بلکہ خود انگریز بھی آپ سے علاج کرا لیا کرتے تھے۔ ایمپرس روڈ پر ایک انگریز رہتا تھا۔ وہ بہت سے ڈاکٹروں سے علاج کرا چکا تھا۔ ایک دن اس کے خانساماں نے کہا۔ صاحب۔ ڈاکٹر تمہارا علاج نہیں کر سکیں گے۔ ہمارے حکیم جی سے علاج کراؤ۔ پہلے تو انگریز نہ مانا۔ آخر کہنے لگا۔ اچھا۔ حکیم کو بلا لاؤ۔ حکیم جی نے نبض پر ہاتھ رکھا اور چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ آپ تو IMPOTENT (نامرد) ہو چکے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پوچھنے لگا۔ آپ کو کس نے بتایا؟ حکیم صاحب نے کہا کہ نبض سے صاف معلوم ہو رہا ہے۔ صاحب بہادر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی لیکن اس نے کہا۔ ہم آپ سے ضرور علاج کرائیں گے۔ حکیم صاحب نے نسخے لکھے۔

جوشاندے ۔ٹکور اور طِلا اور الا بلا۔ صاحب بہادر ان دواؤں سے بہت گھبراتے تھے۔ لیکن انہوں نے پوری پابندی سے تین مہینے علاج کرایا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں خاصی رقم پیش کی۔ اور دو مہینے کے بعد سنا کہ وہ اپنے ایک اینگلو انڈین ہمسائے کی لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ مَیں نے حکیم صاحب نے کہا "حضرت گو قانون آپ کو کچھ نہ کہے لیکن اس اغوا میں اعانت مجرمانہ کا اِرتکاب آپ سے بھی ہوا ہے"

سر سکندر کا عِلاج

ایک دفعہ کا ذکر ہے سردار سکندر حیات خاں لاہور سے کلکتے کا سفر کر رہے تھے کہ ٹرین ہی میں انہیں دردِ گُردہ کی شکایت ہو گئی۔ سید عبدالعزیز بیرسٹر پٹنہ ہمسفر تھے۔ وہ انہیں رستہ ہی میں اُتار کر پٹنہ لے گئے اور کچھ عارضی علاج کرایا۔ جس کے بعد سردار صاحب کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کے ڈاکٹروں سے معائنہ کرایا تو انہوں نے رائے دی کہ آپ وی آنا چلے جائیں گُردہ متورّم ہو رہا ہے۔ اس کا اپریشن ہندوستان میں قابلِ اطمینان نہ ہو سکے گا۔ سردار صاحب گھبرا کر لاہور واپس آ ئے۔ پنجاب کے بہترین ڈاکٹروں نے ان کا علاج شروع کیا۔ لیکن جب حالت میں افاقہ نہ ہوا تو حکیم احمد شجاع صاحب کی تجویز سے حکیم صاحب بُلوائے گئے۔ ڈاکٹروں کو یہ معاملہ ناگوار ہوا۔ لیکن وزیر اعظم کا کیس تھا۔ اس لئے دم بخود رہے۔ حکیم صاحب نے تشخیص کی ورمِ گُردہ تھا۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی تشخیص تھی۔ لیکن تغذیہ کے متعلق اختلاف تھا۔ ڈاکٹر پھلوں کا عرق دے رہے تھے اور حکیم صاحب اپنے اُصولِ طب کے اعتبار سے فرماتے تھے کہ ورم کی حالت میں بارد غذا درست نہیں۔ یخنی وغیرہ دینی چاہیئے۔ آخر حکیم صاحب نے

غذا بدل کر علاج شروع کیا تو چند روز میں افاقہ ہوگیا۔ یہ علاج اس قدر حیرت انگیز تھا کہ "سول" میں اس کے متعلق ایک نوٹ چھپا کہ شفا الملک حکیم فقیر محمد نے چودہ ڈاکٹروں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ حکیم صاحب کے ایک شاگرد حکیم نور احمد صاحب نعمانی نے اس علاج کی پوری تفصیل ایک مضمون کی شکل میں لکھ کر طبی رسائل میں شائع کرائی

گُردے کی پتھری

ایک دفعہ کا ذکر ہے میاں احمد یار خاں دولتانہ نے لڈن (ضلع ملتان) سے ایک طویل تار بھیجا کہ ہمارا مختار عام جس کی عمر اس قدر ہے سات سال سے درد گردہ میں مبتلا ہے۔ ایکس رے سے پتھری معلوم ہوئی اپریشن کرانے پر رضامند نہیں ہوتا۔ آج کل بے حد تکلیف میں ہے۔ ادویہ بھیجئے۔ حکیم صاحب نے نسخے بندھوائے اور پارسل کر کے بھیج دیئے۔ اس کے ساتھ پوری ہدایات لکھ بھیجیں۔ چھ دن کے بعد میاں احمد یار خاں کا تار آیا کہ مختار عام صاحب تندرست ہیں۔ پتھری ٹوٹ کر پیشاب کے ساتھ خارج ہو رہی ہے۔ اس کے بعد مختار عام صاحب نے ایکس رے لیا تو پتھری واقعی غائب تھی۔

اندھی کو آنکھیں مل گئیں

ایک دن حکیم صاحب کے پاس بیرون لاہور سے دو تین آدمی آئے۔ جن کے ساتھ اٹھارہ اُنیس سال کی ایک نوجوان لڑکی تھی جو چند مہینے سے بالکل اندھی ہو رہی تھی۔ لواحقین نے بہت علاج کئے لیکن بینائی بحال نہ ہو سکی۔ آخر حکیم صاحب کے

پاس لاتے۔ حکیم صاحب نے اس کی ساری سرگزشت سُنی تو معلوم ہوا کہ چند ماہ پیشتر اس لڑکی کو ٹائیفائیڈ بُخار ہوا تھا۔ وہ بخار تو جاتا رہا لیکن اپنے ساتھ اس کی بینائی کو بھی لے گیا۔

حکیم صاحب نے نُسخہ لکھ دیا۔ اور فرمایا کہ اسے صبح و شام پلاؤ۔ اس سے مریضہ کو بخار ہوگا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں مجھے اس کی حالت سے روزانہ اطلاع دیتے رہو دو دن نسخہ استعمال کرایا گیا تو لڑکی کو ایک دم ۱۰۳ ڈگری کا بخار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے نُسخہ جاری رکھنے کو کہا۔ تین چار دن میں بخار ۱۰۶ تک پہنچ گیا۔ اعزّہ بہت پریشان ہوئے حکیم صاحب کو خبر ہوئی تو مریضہ کو دیکھنے گئے اور فرمایا کہ حالت بہت امید افزا ہے ایک دن کے لئے نُسخے کا استعمال ناغہ کرو۔

دوسرے دن اس لڑکی نے کہا کہ میری بینائی عَود کر رہی ہے اور مجھے کچھ دُھندلا منظر دکھائی دینے لگا ہے۔ حکیم صاحب نے پہلے نُسخے کو صبح و شام کے بجائے صرف ایک دفعہ استعمال کرنے کی ہدایت دی۔ بخار روز بروز کم ہونے لگا کچھ مزید دوائیں تجویز کیں۔ آخر کوئی دو تین ہفتے کے بعد مریضہ تندرُست ہو کر چلی گئی۔

میرے استفسار پر حکیم صاحب نے بتایا کہ تپ محرقہ کو کوئی حکیم اور کوئی ڈاکٹر زبردستی اتارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیونکہ اس میں جسم کے کسی نہ کسی حصّے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس مریضہ کے ٹائیفائیڈ کا علاج کسی اناڑی معالج نے کیا ہوگا اور جھٹ پٹ بخار اُتار دیا ہوگا۔ اس وقت تپ محرقہ کا مواد غلیظ کہیں آنکھوں کے اعصاب کے آس پاس خون میں گردش کر رہا ہوگا۔ اگر طبعی طریقے سے بخار اترتا تو وہ مواد خارج ہو جاتا لیکن غیر طبعی علاج کی وجہ سے وہ وہیں جم کر رہ گیا اور بینائی بند ہو گئی۔ اب جب

تک اتنی حرارت دوبارہ پیدا نہ کی جاتی۔ جس سے دوران خون تپ محرّقہ کے معیار پر آجاتے۔ وہ مواد وہاں سے جنبش نہ کر سکتا تھا۔ مَیں نے دواؤں کی مدد سے بخار پیدا کیا اور اس سے بینائی بحال ہوگئی۔

نگند بابری

حکیم صاحب پھوڑے پھنسیوں کے لیے ایک نسخہ تجویز کیا کرتے تھے۔ نگند بابری ایک تولہ۔ بارہ تولے عرق مُرکّب مصفّی خون میں رات کو بھگو دی جاتے۔ صبح وہ عرق پی لیا جاتے اور نگند بابری کو پیس کر اس کا تعدہ پھوڑے پر باندھ دیا جاتے۔ مَیں نے یہ نسخہ چند بار استعمال کیا تو بے حد مفید ثابت ہوا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے سید امتیاز علی تاج کو پیٹ کے اُوپر پھوڑا نکل آیا۔ انہوں نے بیلاڈونا اور پلٹس وغیرہ کا علاج کیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر مَیں نے نگند بابری والا نسخہ استعمال کرایا جس سے چند گھنٹے میں پھوڑے کا مواد خارج ہوگیا اور درد وکرب کا نشان بھی نہ رہا۔

چند روز بعد حکیم صاحب کسی دعوت میں امتیاز صاحب سے ملے۔ مزاج پرسی کی۔ امتیاز صاحب نے کہا۔ "بیمار ہوگیا تھا۔ آپ کے علاج سے اچھا ہوگیا۔" حکیم صاحب نے فرمایا۔ آپ تو میرے پاس آتے ہی نہیں۔ علاج کیونکر ہوگیا۔ انہوں نے سارا قصّہ سنایا۔ سُن کر بہت ہنسے۔ کہنے لگے "مَیں بھی کہوں آج کل میرے مطب میں مریض کم کیوں آنے لگے ہیں۔ یہ آج معلوم ہوا کہ سالک صاحب نے نقب لگا رکھی ہے۔

جب اس سے دو چار روز بعد مَیں مطب میں حاضر ہوا تو گدّی سے اٹھ کر الگ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے اب آپ ہی بیٹھ کر مطب کیجیے۔ مَیں بھیک مانگ کر

بسر کر لیا کروں گا۔ مَیں نے کہا۔ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہنسنے لگے اور کہا۔ بندہ خدا میرے نسخوں سے لوگوں کا علاج کرتے پھرو گے تو میرے پاس کون آئے گا؟

پندرہ نسخوں میں پورا مطب

کہا کرتے تھے کہ میں عنقریب مطب کے متعلق ایک چھوٹا سا رسالہ لکھنے والا ہوں مَیں نے عمر بھر کے غور و خوض اور تجربے کے بعد تمام امراض کے علاج کو زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ نسخوں میں محدود کر دیا ہے۔ انہی کے ادل بدل اور ہیر پھیر سے ہر مرض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ صرف اصول تشخیص سمجھ میں آجانے چاہئیں۔ لیکن افسوس زندگی نے وفا نہ کی۔ حکیم صاحب اپنے اس ارادے کو پورا نہ کر سکے۔ ورنہ طب یونانی میں ایک حیرت انگیز کارنامے کا اضافہ ہو جاتا۔

جامع کمالات

حکیم شفاءالملک فقیر محمد چشتی کا مذاق زندگی کے ہر پہلو میں پاکیزہ اور بلند تھا۔ ان کی خوراک پاکیزہ اور لطیف تھی۔ پوشاک اعلیٰ درجے کی اور نفیس۔ وہ زبان دانی اور انشاپردازی میں ہمارے اچھے اچھے ادیبوں سے بھی زیادہ ماہر تھے۔ خصوصاً محاورات دہلی کے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ خوشنویسی اور خطاطی میں دور دور تک ان کی مثال نہ تھی خط نستعلیق میں تو مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کے بڑے بڑے خوش نویس ان کے کمال کا لوہا مانتے تھے۔ ایک دفعہ مصوری کا شوق ہوا تو تختوں، رنگوں، برشوں اور پار خپٹوں کا ایک انبار لگا دیا اور دو تین ہی مہینے میں اتنی مشق بہم پہنچائی۔ کہ آپ

کی بعض تصویروں کے بلاک لاہور کے ادبی رسالوں میں چھاپے گئے۔ اگرچہ شعر بہت کم کہتے۔ لیکن عمر بھر میں جو چند غزلیں کہیں۔ وہ بہت عالی پایہ اور پاکیزہ ہیں۔ آغا حشر کہا کرتے تھے۔ خدا کے لئے فقیر بھائی تم شعر کہنا چھوڑ دو۔ تمہاری مشق جاری رہی تو ہم لوگوں کے چراغ گُل ہو جائیں گے۔

حکیم صاحب جگراؤں ضلع لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ قُدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ جس شخص کی حذاقت کے باعث بیسیوں بے چراغ گھرانے اولاد کی نعمت سے بہرہ ور ہو گئے۔ اس کے ہاں زندگی بھر ایک بچّہ بھی پیدا نہ ہوا۔ لیکن حکیم صاحب کے کمالات کی یاد ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

سیّد حبیب

سنہ ۱۹۱۵ء کے آغاز کا ذکر ہے۔ مَیں اپنے ادبی ماہنامہ "فانوسِ خیال" کی طباعت کے سلسلے میں پٹھانکوٹ سے لاہور آکر مولوی عبدالحق مرحوم کے مطبع رفاہ عام میں مُقیم ہوا جو دارالاشاعت پنجاب کے اندرونی حصے میں واقع تھا۔ دارالاشاعت میں تہذیبِ نسواں اور پھول کے دفتر تھے اور مولوی سیّد ممتاز علی بھی یہیں سکونت رکھتے تھے۔ دارالاشاعت کے مدخل کے مسقّف حصے میں مولوی عبدالحق عام طور پر بیٹھے ہوئے مطبع کے کارکُنوں کو حکم احکام دیا کرتے تھے۔ مَیں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان پھول اخبار کے دفتر سے نکل کر میرے پاس آکھڑا ہوا اور کسی قدر تامُّل کے بعد کہنے لگا کہ فانوسِ خیال کے ایڈیٹر آپ ہی ہیں؟ اثبات میں جواب پاکر اس نے کہا آیئے کمرے میں چل

کر بیٹھیں اور باتیں کریں۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں گیا تو اس نے بتایا کہ میں حبیب اللہ جلال پوری ہوں اور یہاں دارالاشاعت میں مولوی صاحب کے اخباروں کا کام کر رہا ہوں۔ باتوں ہی باتوں میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ حبیب اللہ صاحب کو پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اس وقت حبیب صاحب کا حلیہ یہ تھا۔ میانہ قامت۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ معمولی کپڑے کا کوٹ اور پتلون پہنتے تھے۔

مولوی ممتاز علی بہت فاضل اور مردم شناس آدمی تھے۔ اپنے اخباروں میں حبیب صاحب سے ایڈیٹری کا نہیں بلکہ منشی کا کام لیتے تھے کیونکہ حبیب صاحب کا مبلغ علم بہت محدود تھا۔ میں واپس پٹھانکوٹ چلا گیا اور جب ۱۹۱۵ء کے اواخر میں لاہور پہنچا تو حبیب اللہ صاحب منشی محمد دین فوق مرحوم کے اخبار "کشمیری" میں کام کر رہے تھے یہاں سے وہ کسی فوجی محکمے میں بھرتی ہو کر مشرق بعید چلے گئے اور زیادہ تر دوران جنگ میں شنگھائی ان کا مستقر رہا۔

ترمذی۔ رہبر۔ نقاش

جنگ عظیم کے دوران ہی میں حبیب اللہ صاحب واپس آکر کلکتہ میں مقیم ہوئے۔ صحافت کو چھوڑ کر گئے تھے۔ اب دوبارہ صحافت سے رشتہ جوڑنے کی فکر میں تھے۔ کلکتہ میں ایک صاحب ڈاکٹر ترمذی رہتے تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا اخبار "ترمذی" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ حبیب صاحب نے اس کی ایڈیٹری اختیار کی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ پنجاب میں سر مائیکل اوڈوائر کی سخت گیری کے باعث اخبارات بند ہو چکے تھے اور یہاں کے لوگ جنگ کی خبروں کے لئے دوسرے صوبوں کے

اخباروں کے محتاج رہتے تھے۔ چنانچہ بجنور کے "مدینہ" اور "نجات" اپنے "ہفتہ جنگ" کی دلچسپی کی وجہ سے بہت پڑھے جاتے تھے۔ کلکتہ کی فضا نسبتاً بہتر تھی۔ "ترمذی" بھی لاہور میں فروخت ہونے لگا۔ جب اس کا داخلہ بند کر دیا گیا تو حبیب صاحب نے "رہبر" اور "نقاش" کے نام سے یکے بعد دیگرے دو اخبار جاری کئے۔ اسی زمانے میں چودھری غلام حیدر خاں اور قاضی عبدالغفار بھی کلکتے پہنچ گئے۔ اوّل الذکر نے یکے بعد دیگرے ترجمان اور صداقت جاری کئے اور قاضی صاحب نے جمہور نکالا۔ یہ سب اخبارات ہزاروں کی تعداد میں پنجاب بھیجے جاتے تھے۔ اور جب حکومت پنجاب ایک اخبار کا داخلہ بند کر دیتی تھی تو اس کی جگہ دوسرا جاری کر دیا جاتا تھا۔

سیّد حبیب شاہ مدیر سیاست

کچھ مدت تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ لیکن جنگ کے خاتمے پر جب تقریر و تحریر کی آزادی کسی حد تک بحال ہوئی اور "زمیندار" نہایت آب و تاب سے نکل آیا تو کلکتے کے یہ سب اخبارات ایک ایک کر کے بند ہو گئے۔ چودھری غلام حیدر خاں نے لاہور آ کر اپنا "صداقت" ہفتہ وار جاری کیا اور حبیب اللہ صاحب نے جو اب "سیّد حبیب شاہ" ہو گئے تھے لاہور میں روزنامہ "سیاست" کی بنیاد رکھی۔ دہلی دروازے کے باہر جہازی بلڈنگ کے ایک حصے میں زمیندار کا دفتر تھا۔ اس کی پشت پر سیّد حبیب نے سیاست کا دفتر قائم کر رکھا تھا اور چونکہ اب یہ دونوں اخبار ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے سیّد حبیب اکثر مولانا ظفر علی خاں کے خلاف اپنے اخبار میں نوک جھونک کرتے رہتے تھے۔

لیکن چونکہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا آغاز ہو چکا تھا اور سید حبیب بھی مولانا ظفر علی خان ہی کی طرح اس میں شامل تھے۔ اس لئے زیادہ کشمکش کی نوبت نہیں آئی۔ میں زمیندار کا ایڈیٹر تھا اور سید صاحب کے متعلق میں نے یہ مسلک اختیار کر رکھا تھا کہ وہ زمیندار یا مولانا کے خلاف کچھ بھی لکھیں اس کا جواب زمیندار میں نہ دیا جاتے اور کامل خاموشی اختیار کی جاتے۔ اس سے سیّد صاحب بہت بھنّاتے تھے لیکن کچھ کر نہ سکتے تھے۔

میانوالی جیل میں

تحریک میں سیّد حبیب کو تین سال قید کی سزا ہوئی۔ کچھ مُدّت لاہور وغیرہ کے جیلوں میں رہنے کے بعد وہ میانوالی جیل میں پہنچے۔ جب ہمارا قافلہ میانوالی جیل میں داخل ہوا تو ہمیں یہ سن کر افسوس ہوا کہ سید حبیب اس جیل میں عام قیدیوں کی طرح رکھے گئے ہیں۔ ہم نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو توجہ دلائی۔ کہ سیّد صاحب ایک روزانہ اخبار کے مالک اور ایڈیٹر ہیں۔ اگر ہمیں سپیشل کلاس دی گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ سید صاحب سے یہ ناواجب سلوک روا رکھا جاتے۔ سیّد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جیل کی خوراک اور مُشقّت کی وجہ سے ان کا رنگ کالا پڑ گیا تھا۔ اور کمزور بھی ہو گئے تھے۔ خیر سپرنٹنڈنٹ صاحب کی رپورٹ پر وہ بھی درجۂ خاص میں شامل کر دیئے گئے اور تکلیف کا دور ختم ہوا۔

جیل میں جب مختلف درجوں کے قیدیوں کی تقسیم عمل میں آئی تو مسلمان سپیشل قیدی ایک وارڈ میں۔ ہندو سپیشل دوسرے وارڈ میں اور باقی کارکُن اور رضاکار تیسرے وارڈ میں جمع کر دیئے گئے۔ سیّد حبیب بھی اسی وارڈ میں بھیجے گئے جس میں اختر علی خان، عطاء اللہ شاہ بخاری

مولانا داؤد غزنوی، مولانا احمد سعید اور دوسرے احباب رکھے گئے تھے۔ لیکن چونکہ سید صاحب ہر وقت لیڈری کی ہوا میں اُڑتے رہتے تھے اور ہم لوگوں کی بے تکلفیوں سے اکثر منغّص ہو جایا کرتے تھے۔ اس لئے وہ ہمارے ساتھ نہ رہ سکے اور سپرنٹنڈنٹ سے کہہ کر رضاکاروں کے وارڈ میں منتقل ہو گئے۔ جہاں وہ لڑکوں کو باہر سے کھانڈ وغیرہ منگا کر دیتے اور ان سے ہر گونہ خدمت لیتے رہتے۔ پھر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی آ گئے۔ اور اسی وارڈ میں سید حبیب کے ہمسائے اور رفیق کی حیثیت سے مقیم ہو گئے لیکن یہ رفاقت چند روزہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ حبیب الرحمٰن علالتِ طبع کی وجہ سے دھرم سالہ جیل بھیج دیئے گئے۔

قبوں کی شکست کا ہنگامہ

تحریک ختم ہونے کے بعد جب سیاسی قیدی رہا ہوئے تو سید حبیب نے بھی دوبارہ صحافت اور قیادت کا رنگ و روغن درست کرنا شروع کر دیا۔ اور اکثر مولانا ظفر علیخاں اور زمیندار کے مُنہ آنے لگے۔ یہ مقابلہ نہایت نازیبا تھا۔ اس لئے کہ دونوں حریفوں کی قابلیت اور حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کہاں مولانا ظفر علی خاں۔ کہاں سید حبیب۔ لیکن ہم زمیندار میں اسی مسلک پر قائم رہے۔ جو میں نے پہلے دن تجویز کیا تھا۔ سید صاحب ہمارے خلاف لکھتے رہے اور ہم علی العموم طرح دے جاتے۔

اتنے میں سلطان ابنِ سعود نے حجاز پر حملہ کر دیا اور خاندان شریفی بے دخل ہو کر آوارۂ روزگار ہو گیا۔ سلطان کی فوج کے ایک حصے نے جو متشدد نجدی قبائل (غطغط اور دخنہ وغیرہ) پر مشتمل تھا۔ طائف میں بعض مزاروں کے قبّے خلاف شریعت قرار دے

کر توڑ ڈالے۔ اس پر مسلمانانِ ہند دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک طبقہ یہ کہتا تھا کہ قبروں پر عمارت بنانا یقیناً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منع کیا ہے۔ اور قبوں کے گرانے میں سلطان ابن سعود کی فوج نے کوئی خلافِ شریعت حرکت نہیں کی۔ گو سیاسی مصلحت کے رُو سے انہیں فی الحال اس سے محترز رہنا چاہیئے تھا۔ اس طبقے کا ترجمان زمیندار تھا۔ دوسرا طبقہ مراد آباد۔ بدایوں۔ بریلی اور پنجاب وغیرہ کے بدعتی علماء و مشائخ پر مشتمل تھا جو سلطان ابن سعود کے خلاف کُفر کے فتوے صادر کر رہا تھا اور عوام میں وہابیوں کے خلاف شورش پھیلا رہا تھا۔ ان لوگوں نے حزب الاحناف اور خُدّام الحرمین کے نام سے اپنی تنظیمات بھی قائم کر رکھی تھیں۔ چونکہ مولانا ظفر علی خاں اوّل الذکر طبقے کے ساتھ تھے۔ اس لئے سیّد حبیب نے دوسرے طبقے سے اپنا تعلّق استوار کیا۔ وہ دیکھتے دیکھتے حنفیوں۔ صوفیوں اور ان کے عقیدت مندوں کے منظور نظر بن گئے اور سیاست کی اشاعت بھی بڑھ گئی۔

سیّد صاحب اس زمانے میں بڑے لیڈر بن گئے تھے اور ہر وقت ان کے دفتر میں عُلماء و مشائخ کا جمگھٹا رہتا تھا۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ ان کے بڑے سرپرست تھے اور پنجاب اور یوپی کے بڑے مشائخ کی درگاہوں میں سیّد حبیب کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

افغانستان سے تعلُّقات

چند سال بعد جب افغانستان میں بچہ سقہ نے ہنگامہ برپا کیا۔ اور جنرل نادر خاں فرانس سے اس فتنے کے سدِّباب کے لئے آ گئے۔ تو سیّد صاحب نے جنرل صاحب سے سلسلۂ مواخات قائم کیا۔ اور علی العموم افغان اکابر کی خاطر مُدارات میں سرگرم رہنے لگے۔ جب کبھی

شاہ ولی خاں۔ شاہ محمود خاں یا احمد شاہ خاں لاہور سے گزرتے۔ سید صاحب ناشتہ دان لئے ہوئے سٹیشن پر موجود ہوتے اور افغان دوستوں کو کھانا وانا کھلاتے۔ نادر شاہ شہید کی کامیابی کے بعد افغانستان سے سید صاحب کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔

قلات وخاران

سید حبیب اپنے اخبار کی مالی امداد کے لئے اکثر ذی حیثیت حضرات کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں قلات وخاران چترال وغیرہ کے سفر بھی اختیار کئے ایک دن سید حمید علی مالک دارالاشاعت کے پاس بیٹھے تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ دوران گفتگو میں میں نے کہا۔ چترال اور قلات تو خیر۔ لیکن خاران کی ریاست اب تک گمنامی میں تھی اس ملک کے کولمبس تو آپ ہی ہیں۔ یہ سن کر بہت برافروختہ ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ "انقلاب" دکن اور بھوپال کو اپنے قابو میں لے آئے تو آخر میں کیا کروں۔ میں نے قلات اور خاران ڈھونڈ نکالے۔ (اس زمانے میں ریاست حیدرآباد دکن "انقلاب" کے پانچسو پرچے خرید رہی تھی۔ سید صاحب کا اشارہ اسی طرف تھا۔

دیودار کا جنگل

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ سید حبیب چترال گئے۔ جب مہتر صاحب سے "سیاست" کی بدحالی کا ذکر کر کے ان سے استمداد کی تو انہوں نے فرمایا کہ افسوس ہے میں کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری ریاست میں دیودار کا ایک جنگل موجود ہے۔ جس کی لکڑی اب بالکل پختہ اور کاٹنے کے قابل ہے لیکن افغانستان کے ساتھ اختلافات ہیں

وہ ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس لکڑی کو دریائے کابل کے راستے سے مارکیٹ میں پہنچا دیں۔ اگر آپ افغانستان کو ہموار کر سکیں تو میں آپ کو اجازت دے دوں گا کہ دیودار کے پانچ ہزار درخت آپ لے جائیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ سیّد صاحب کو نادر شہید کی دوستی پر بڑا اعتماد تھا انہوں نے کہا بھلا یہ کونسی بڑی بات ہے۔ میں افغانستان کو ضرور ہموار کر لوں گا۔ اس قرارداد کے بعد سیّد حبیب لاہور آئے۔ اپنے دوستوں سے اس سودے کا ذکر کیا۔ یہاں تک کہ لالہ ہرکشن لال سے ملے اور کہا کہ آپ ابتدائی مصارف کے لئے مجھے کچھ روپیہ دے دیں۔ اس کے بعد میں چترال کی لکڑی کو سوبہ سرحد کی مارکٹ تک پہنچانے کا تردّد کروں گا اور منافع میں میرا اور آپ کا حصّہ نصفا نصف ہوگا۔ لالہ ہرکشن لال نے سیّد صاحب کو تین ہزار روپے قرض دے دیئے اور اپنے بیٹے جیون لال گابا سے کہا کہ تم تین چار دوسرے کارکنوں کو ساتھ لو اور سیّد حبیب کی معیّت میں افغانستان چلے جاؤ۔ جب سیّد صاحب لکڑی کے لانے کا بندوبست کر لیں تو اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ان کی مالی امداد کرو۔ ان دنوں سیّد صاحب نے کئی اضلاع کا دورہ کر کے جیون لال گابا اور ان کے رفیقوں کے لئے افغانستان کے پاسپورٹوں کا بندوبست کیا۔ اور ان کو ساتھ لے کر پشاور روانہ ہوئے۔

۔ وہاں کے افغانی ویزا آفیسر نے اپنی حکومت سے استفسار کیا تو سردار ہاشم خان نے حکم بھیجا کہ صرف سیّد حبیب کو ویزا دے دو کہ وہ یہاں آ کر جو گفتگو کرنا چاہتے ہیں کریں۔ باقی آدمیوں کو یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

افغانستان ہموار نہ کیا جا سکا

سید صاحب بہت جز بز ہوئے لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات۔ رُفقاء کو پشاور میں چھوڑ کر کابُل گئے۔ سردار ہاشم خاں وزیراعظم سے ملاقات کی۔ سردار صاحب نے کہا سید صاحب آپ کمال کرتے ہیں۔ ہمارے آپ کے تعلقات ذاتی اعتبار سے کتنے ہی گہرے اور مُخلصانہ ہوں لیکن یہ تو بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ چترال کے خلاف ہمیں بہت سی شکایات ہیں محض آپ کی لکڑی کی خاطر ہم کیونکر چترال کے آگے سرِ تسلیم خم کردیں۔ افسوس ہے کہ حکومت افغانستان اس معاملے میں آپ کی کوئی امداد نہیں کرسکتی سید صاحب سخت پریشان ہوئے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے۔ نادر شاہ شہید سے بھی عرض کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر بے نیلِ مرام واپس آئے اور پانچ لاکھ کمانے کا وہ خواب جس نے ان کو مہینوں شیخ چلی کے منصوبے سوچنے میں مصروف رکھا تھا ہاشم خاں کے ایک فقرے سے پریشان ہو کر رہ گیا۔ لالہ ہرکشن لال نے تین ہزار روپے واپس طلب کئے جو سید صاحب سے ادا نہ ہو سکے۔

سیاست سے آخری ضمانت

سردار سکندر حیات خاں پنجاب کے وزیراعظم ہوئے تو سید حبیب صاحب نے ان سے تعلقات قائم کرنے اور کچھ استفادہ فرمانے کی کوشش کی۔ مایوسی ہونے پر ان کے خلاف نہایت بدآہنگی سے اپنے اخبار میں مضامین لکھے اور ان میں قانون و آئین کی حدود سے تجاوز کر گئے۔ چنانچہ حکومت پنجاب نے "سیاست" سے سات ہزار

کی ضمانت طلب کر لی۔ ضمانت داخل نہ کی جا سکی "سیاست" بند ہو گیا۔ اور ایسا بند ہوا کہ پھر کبھی جاری نہ ہو سکا۔ نادر شاہ شہید کی شہادت کے بعد چونکہ کابل کا وظیفہ علامہ صلاح الدین سلجوقی (سفیر افغانستان ور ہند) کی رپورٹ پر بند کر دیا گیا تھا۔ اس لئے سید صاحب نے اعلیٰحضرت ظاہر شاہ کے خلاف اپنے ایک اخبار "منشور" میں مضامین لکھے۔ سفارتِ افغانستان کے توجّہ دلانے پر حکومت نے اس اخبار کو بند کر دیا۔ اور سید حبیب کو جیل خانے میں بھیج دیا۔

اس کے بعد سید صاحب مدت دراز تک منقار زیر پر رہے۔ حصولِ معاش کے لئے مسلم انڈیا انشورنس کمپنی کی ایجنسی اختیار کی اور اکثر پریشان روزگار اور بدحال رہے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ایک روزنامہ غازی نکالا جو چل نہ سکا اور آخر بڑے نقصان کے بعد بند کرنا پڑا۔

سفر وسیلۂ ظفر

سید صاحب کا طریقہ "سیاست" کے زمانے میں بھی اور بعد بھی یہی رہا کہ ہر مہینے اپنے سفر کی ایک سمت مقرر کر لیتے۔ لاہور سے چل کر کبھی امرتسر۔ جالندھر۔ لدھیانہ، دہلی اور لکھنو کا دورہ کرتے۔ کبھی دہلی سے سورت اور بمبئی کا رخ کر لیتے۔ کبھی منٹگمری ملتان بہاول پور۔ کراچی۔ قلات اور خاران تک چلے جاتے۔ بیس بائیس دن کے بعد کچھ عطیات کچھ اخبار کے چندے۔ اور کچھ اشتہارات کی اجرت لے کر لدے پھندے اور سالماً غانماً واپس آتے۔ اپنی دونوں بیگموں کو خرچ دیتے۔ ملازموں کو تنخواہیں بانٹتے۔ دفتر کے دوسرے مصارف پورے کرتے اور آٹھ دس دن کے بعد پھر رختِ سفر باندھ لیتے

ان کے دفتر کے ملازم کبھی غیر مطمئن نہیں رہے۔ ان کے دفتر میں کبھی ہڑتال نہیں ہوئی سب کے واجبات ادا کر دیتے۔ خواہ اس کے لئے انہیں دربدر گھومنا پڑتا۔ جب غازی جاری کیا گیا تو لاہور کے ہر قابل ذکر پڑھے لکھے آدمی سے ملے۔ اکثر کو اخبار کا خریدار بنایا۔ بعض سے عطایا وصول کئے۔ لیکن زمانہ بدل چکا تھا۔ اخبار کے مصارف میں اضافہ ہو چکا تھا اور مقابلے میں دس اخبار جاری تھے۔ اس لئے سیّد صاحب کی انتہائی محنت کے باوجود غازی ناکام ہو گیا۔

سیّد صاحب کی خوبیاں

سیّد حبیب نہایت محنتی۔ جفاکش۔ باہمت۔ دوستوں کے مخلص دوست اور دشمنوں کے سخت دشمن واقع ہوئے تھے۔ مشکلات و مصائب سے ہرگز پریشان نہ ہوتے تھے۔ بڑے سے بڑے افسر اور بڑے سے بڑے لیڈر سے ٹکرا جانے میں تامّل نہ کرتے تھے۔ ان کے برادرِ کوچک سیّد عنایت شاہ مرحوم نیکی اور شرافت اور کاروباری دیانت کے پتلے تھے۔ انہوں نے سیّد صاحب کے اخبار کے انتظامات سنبھال رکھے تھے۔ اور سیّد حبیب دن رات اپنے اخبار کو۔ اپنی تحریکات کو۔ اپنی لیڈری کو اور اپنی مساعی فراہمی زر کو تقویت دیتے میں مصروف رہتے تھے۔ لوگوں کی سفارشیں کرنا۔ محتاجوں کی امداد کا جتن کرنا۔ غریب مسلمان نوجوانوں کو ملازمتیں دلوانا اور بعض مظلوموں کے لئے افسروں سے لڑنا جھگڑنا سیّد حبیب کا عام شعار تھا۔ ان کی کمزوری صرف ایک تھی کہ روپیہ پیسہ کافی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بعض

اوقات حدودِ جواز سے تجاوز کر جاتے تھے۔ اس کے سوا باقی اعتبارات سے وہ خوب انسان تھے۔ عمر کے آخری سالوں میں بعض عوارض لاحق ہو گئے تھے۔ آخر بے زری اور تفکرات اور امراض نے قابو پا لیا اور ۱۹۵۱ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے

اللّٰہم اغفر لہٗ

مولانا تاجور نجیب آبادی

نجیب آباد کے مولوی احسان اللہ خاں تاجور نے نو سال دیوبند کے دار العلوم میں بسر کر کے عُلومِ دینی میں فراغتِ تحصیل کی سند حاصل کی۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا علم و فضل حصولِ معاش میں معاون نہ ہوگا۔ کسی مسجد میں پیش امام بننا۔ ختم درُود پڑھنا اور جنازے کی نمازیں پڑھانا نہ مولوی تاجور کے ذوق کو گوارا تھا نہ اس سے قوُتِ لایموت بآسانی میسّر آ سکتی تھی۔ وہ شاعر آدمی تھے اور شاعری کے جراثیم جس شخص کے ذہن میں پرورش پا رہے ہوں اس کا علمائے دین کی صف میں کھڑے ہونا اور اپنی زندگی میں زہد و تقویٰ کا اہتمام کرنا بے حد دُشوار ہے۔ اس احساس کے ماتحت انہوں نے فیصلہ کیا کہ پنجاب جا کر مشرقی امتحانات پاس کئے جائیں اور مُدرّسی کا پیشہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ وہ

۱۹۱۵ء میں لاہور پہنچکر اورینٹل کالج میں داخل ہو گئے۔

دیال سنگھ سکول میں

مولانا تاجور استاذی رسا رام پوری کے شاگرد تھے۔ اس لئے میرے ساتھ خواجہ تاشی کے تعلقات رکھتے تھے۔ ہماری خط و کتابت جاری تھی۔ "فانوس خیال" میں ان کا ایک مکتوب بھی شائع ہو چکا تھا۔ جب ۱۹۱۵ء کے اواخر میں مَیں نے لاہور میں مولوی سید ممتاز علی کے ہاں ملازمت اختیار کی تو مولانا تاجور سے پہلی دفعہ نیاز حاصل ہوا۔ وہ اس زمانے میں اورینٹل کالج کے ہاسٹل میں رہتے تھے جو شاہی مسجد اور قلعہ کے درمیانی کمروں میں قائم ہوا تھا۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کرکے تاجور صاحب دیال سنگھ ہائی سکول میں اورینٹل ٹیچر ہو گئے۔ اس سکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ رگھوناتھ سہائے نہایت باوضع۔ غیر متعصب اور بلند اخلاق آدمی تھے اور مولانا تاجور ان کی خوبیوں کے اس قدر گرویدہ تھے کہ انہیں فرشتہ کہا کرتے تھے۔ رگھوناتھ سہائے جیسے ہندوؤں کے حسنِ سلوک ہی کا نتیجہ تھا کہ مولانا تاجور کے مخلصانہ روابط زندگی بھر ہندوؤں اور سکھوں ہی کے ساتھ رہے۔ مسلمان اکابر میں سے صرف دو تین ہی سے مولانا کی رسم و راہ تھی۔

مخزن کی ایڈیٹری

رسالہ "مخزن" سر عبد القادر کے قبضے سے نکل کر ایک ریٹائرڈ تحصیل دار غلام رسول صاحب کی ملکیت میں منتقل ہو گیا۔ جن کے انتقال کے بعد ان کے بھائی

ظہور الدین اس کو چلاتے رہے۔ مولانا تاجور نے "مخزن" کی ایڈیٹری قبول کر لی۔ زمانے کی کیفیت دیکھئے کہ مدیر "مخزن" کی حیثیت سے مولانا تاجور کی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ تھی۔ اور جن دنوں مولانا کھانا بھی ظہور الدین صاحب ہی کے ہاں کھاتے ان دنوں نقد صرف پانچ روپے ملتے۔ جب مولانا موسم گرما کی تعطیلات میں نجیب آباد چلے جاتے تو "مخزن" کی ایڈیٹری کا پشتارہ میرے کندھوں پر رکھ جاتے اور میں بلا معاوضہ اس خدمت کو انجام دیتا۔

ہمایوں میں

مولانا تاجور زبان کی سُوجھ بُوجھ خاصی رکھتے تھے اور غزل بہت اچھی کہتے تھے۔ ان ہی دنوں جسٹس شاہ دین مرحوم نے انہیں یاد فرمایا۔ کیونکہ میاں بشیر احمد نے "ہمایوں" جاری کر دیا تھا اور انہیں صرف ایک مدیر معاون ہی کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ ابتدائی عربی کتابیں بھی پڑھنا چاہتے تھے۔ مولانا تاجور میاں بشیر احمد صاحب کے رفیق کار بن گئے اور "ہمایوں" کو حسن ترتیب کے ساتھ بلند معیار پر مرتّب کرنا شروع کیا۔ تاجور صاحب کی یہ تمام ادبی مصروفیتیں اپنی مستقل ملازمت کے علاوہ تھیں۔ دیال سنگھ ہائی سکول کی ہیڈ ٹیچری سے ترقی کر کے وہ دیال سنگھ کالج میں فارسی کے لکچرر مقرر ہو گئے تھے لیکن ادبی رسالوں کا مرتّب کرنا اور نوجوانوں کو نثر و نظم میں اصلاح دینا ان کا دائمی مشغلہ رہا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک انجمن ارباب علم کی بنیاد رکھی۔ جس کے پُر رونق مشاعرے ایس پی ایس کے ہال میں ہونے لگے۔ مولانا تاجور کے احباب اور ان کے شاگرد اس مشاعرے میں ذوق شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اور میں بھی اکثر اپنا کلام انہی

مشاعروں میں پڑھتا تھا۔

"بزم ادب"

کچھ مدت بعد جب حفیظ جالندھری لاہور کے ادبی اُفق پر نمودار ہوئے تو ہم نے ان کا تعارُف بھی انجمن ارباب علم ہی کے سٹیج پر کرایا اور حفیظ کی پہلی نظمیں اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ لیکن حفیظ کی روز افزوں ہر دلعزیزی سے مولانا کچھ کھٹک سے گئے۔ ادھر وہ کوتاہی ظرف میں مبتلا۔ اِدھر یہ زود رنج۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمکش شروع ہو گئی اور حفیظ صاحب نے جھٹ ایک "بزم ادب پنجاب" کی بنا ڈالی اور مجھے اس کا صدر مقرّر کر کے پہلے مشاعرے کا اعلان کر دیا۔ اب تاجور صاحب بے حد پریشان ہوئے۔ انجمن ارباب علم کے مشاعرے بہت "دُبلے" ہو گئے اور سالک و حفیظ کے دوستوں نے بزم ادب کو چار چاند لگا دیئے۔ لیکن یہ حفیظ صاحب کا ایک عارضی سا جوش تھا جو چند روز میں ٹھنڈا پڑ گیا اور بزمِ ادب درہم برہم ہو گئی۔

کانگرسیوں کا ہنگامہ

اس سے قبل ۱۹۲۳ء میں مولانا تاجور نے ایک مشاعرہ رائے بہادر دولت رام کالیہ بیرسٹر فیروزپور کی صدارت میں منعقد کیا۔ رائے بہادر حکومت کے نہایت خوشامدی اور کانگرس کے دشمن واقع ہوتے تھے اور قومی تحریک ابھی باقی تھی۔ ہزاروں مجاہدینِ حُریت جیل خانوں میں مُقیّد تھے۔ اس لئے کانگرسیوں اور دوسرے آزادی پسندوں کو ایک ادبی انجمن کی طرف سے ایک ٹوڈی کی اس عزت افزائی پر

بہت غصہ آیا۔ اور کانگرسی رضاکاروں نے مشاعرے میں ابتری پیدا کرنی شروع کر دی۔ اتنے میں مَیں ایس پی ایس کے ہال میں پہنچ گیا۔ چونکہ حال ہی میں سیاسی قید سے رہا ہو کر آیا تھا۔ اس لئے پُرزور تالیوں سے میرا خیر مقدم کیا گیا۔ مولانا تاجور نے مجھے سٹیج پر بٹھایا۔ کانگرسیوں کی حرکت کا قصہ سنایا۔ اور کہا کہ آپ ذرا سی کوشش سے اس مشاعرے کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ خیر مَیں اٹھا۔ ایک دو لطیفے سنا کر مجلس کو شگفتہ کیا۔ پھر اپنا کلام سنایا اور دوسرے شعراء کو پڑھوایا۔ کانگرسیوں نے میرے لحاظ کی وجہ سے اس کے بعد شور نہ مچایا۔

مولانا تاجور اس داغ کو دھونے اور انجمن ارباب علم کو بدنامی اور غیر ہر دلعزیزی سے بچانے کے لئے بے حد مضطرب تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے خدا کے لئے آئندہ اجلاس کی صدارت آپ کر دیجئے۔ مَیں نے قبول کیا اور اخباروں میں اعلان ہو گیا۔ دوسرے ہی دن ڈاکٹر ستیہ پال سیکرٹری کانگرس کمیٹی کا ایک خط مجھے موصول ہوا۔ جس میں لکھا تھا کہ مولوی تاجور نے رائے عامہ کی توہین کی ہے۔ اور کانگرس کی دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ جب تک اس توہین کی تلافی نہ ہو جائے آپ مشاعرے کی صدارت نہ کریں۔ مَیں نے جواب میں لکھ دیا۔ کہ آپ یقین رکھیے مَیں کسی حالت میں کانگرس اور رائے عامہ کی توہین کو محض صدارت مشاعرہ کی خاطر برداشت نہ کروں گا اور انتہائی کوشش کروں گا کہ مولانا تاجور معقول رویہ اختیار کریں۔ آپ بھی اپنے کارکنوں اور رضاکاروں کو ہدایت کر دیں کہ بیکار شور و غوغا سے محترز رہیں۔

مشاعرہ کامیاب ہوا

مشاعرے سے پہلے مَیں نے مولانا تاجور کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ انعقادِ مجلس کے آغاز ہی میں سٹیج پر آ کر معقول الفاظ میں معذرت کر دیں اور اعلان کر دیں کہ انجمن ارباب علم اگرچہ سیاست سے بے تعلق ہے لیکن اپنی قومی انجمن (کانگرس) اور آزادیٔ ہند کے نصب العین کی کسی توہین کو روا نہ رکھے گی۔ مشاعرہ ہوا۔ اور مَیں نے دیکھا کہ اس میں بہت سی گاندھی ٹوپیاں موجود ہیں۔ مَیں الگ بیٹھا رہا۔ جب مولانا تاجور اپنی معذرت پڑھ چکے۔ اور تجویز صدارت ہو گئی۔ تو مَیں آ کر کرسیٔ صدارت پر بیٹھ گیا۔ اس پر جلسے نے بے حد خوشنودی اور جوش و خروش کا اظہار کیا۔ مَیں نے کھڑے ہو کر کہا۔ کہ دیش بندھو چترنجن داس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے بڑے بڑے جرنیلوں میں سے تھے اور اس کے علاوہ بنگلہ زبان کے نہایت شیوا بیان شاعر تھے۔ خود ڈاکٹر ٹیگور ان کی شاعری کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ دیش بندھو داس کے اعزاز میں انجمن ارباب علم کے اس مشاعرے کے حاضرین سروقد کھڑے ہو کر دو منٹ کی خاموشی اختیار کریں۔ اس کے بعد مشاعرے کی کارروائی شروع کی جائے گی۔

غرض فضا بالکل صاف ہو گئی۔ "گاندھی ٹوپیاں" جو اس لئے جمع تھیں کہ ضرورت پڑے تو مولوی تاجور پر پل پڑیں۔ نہایت سکون سے مشاعرہ سنتی رہیں اور انجمن ارباب علم اس آفت سے بچ گئی۔

فیروز پور کا مشاعرہ

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر اقبال پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے تو بعض مقامات سے انہیں دعوتیں آنے لگیں کہ تشریف لائیے کیونکہ لوگ آپ کی زیارت کے خواہاں ہیں۔ فیروز پور میں میاں تصدق حسین خالد ای اے سی تھے۔ وہ ایک دن لاہور آئے اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی کہ آپ فلاں تاریخ کو فیروز پور آئیے۔ آپ کا جلوس نکالا جائے گا۔ آپ کی صدارت میں ایک مشاعرہ کیا جائے گا۔ اور شام کو گارڈن پارٹی دی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جلوس میرے ذوق کے خلاف ہے۔ مشاعرے کی صدارت میری جگہ سالک صاحب کریں گے اور میں پارٹی میں شامل ہو جاؤں گا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلوایا اور حکم دیا کہ آپ فلاں تاریخ فیروز پور جا کر مشاعرے کی صدارت کریں۔ میں نے سر تسلیم خم کیا۔ گھر واپس آ کر حفیظ صاحب کو بلایا اور کہا کہ کل صبح چند شعرا کو ساتھ لیجئے۔ اور میرے ساتھ فیروز پور چلئے۔ وہ اٹھ کر پنڈت ہری چند اختر کی طرف چلے گئے۔ سردار اودھے سنگھ شائق وکیل فیروز پور تاجور صاحب کے شاگرد تھے اور اہل فیروز پور کی طرف سے شعرا کو لوا لے جانے کے لئے لاہور آئے ہوئے تھے۔ دوسرے دن صبح کو ہم لوگ ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا تاجور بھی پنڈت کیفی دہلوی۔ میلا رام وفا۔ منوہر سہائے انور۔ دین محمد فاخر وغیرہ کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ یہ واقعہ اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ حفیظ صاحب کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے مولانا نے مجھ سے سلسلۂ کلام و سلام بند کر دیا تھا۔ اور

مجھے اپنا حریف سمجھتے تھے۔ اس قافلۂ شعرا کی ترتیب بھی اسی سلسلے میں کی گئی تھی۔ چونکہ مَیں پہلی دفعہ بیرونِ لاہور کے کسی مشاعرے میں گیا تھا اور پھر علامہ اقبال کا نامزدہ صدر تھا۔ اس لئے فیروزپور میں میری آؤ بھگت بہت تپاک سے کی گئی۔ اور مولانا تاجور چونکہ روز کے آنے جانے والے تھے اس لئے ان کی طرف توجہ نسبتہً کم رہی اس لئے مولانا نے سردار اودھے سنگھ شائق کی کوٹھی پر جاکر اپنے آدمیوں کی ایک خفیہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی کہ مشاعرے کی صدارت پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کریں۔ کیونکہ وہ سب کے بزرگ ہیں اور سالک صاحب کو بھی ان کے نام سے اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ مجھ سے استصواب کیا جاتا۔ میاں تصدق حسین خالد نے کہہ دیا کہ جس شخص کے اعزاز میں آج کی تقریب ہو رہی ہے۔ جب اسی نے مشاعرے کی صدارت کے لئے اپنا قائم مقام نامزد کر رکھا ہے تو پھر ہم کیونکر کسی دوسرے آدمی کا نام لے سکتے ہیں۔ غرض تاجوری قافلہ مجبوراً مشاعرے میں شریک ہوا۔ اور مشاعرے کے اواخر میں مَیں نے حفیظ جالندھری سے پہلے۔ کیفی۔ تاجور۔ وفا اور انور کو پڑھوا دیا۔ جب حفیظ کھڑے ہوئے تو یہ قافلہ چلے جانے کے لئے پَر تولنے لگا۔ جانتے تھے کہ صدر بے ڈھب آدمی واقع ہوا ہے۔ سرِ مشاعرہ دو تین چوٹیں کر دے گا۔ اس لئے پنڈت کیفی کو میرے پاس بھیجا کہ صدرِ جلسہ اجازت دیں تو ہم لوگ چلے جائیں۔ شہر میں کچھ کام ہے۔ پنڈت جی کے ارشاد پر مَیں کیا عرض کر سکتا تھا۔ بخوشی اجازت دے دی۔ اور یہ لوگ چلے گئے۔

عُلماء دیوبند کی ڈانٹ

میرا اور مولانا کا رابطہ کلام و سلام ایسا بند ہوا کہ سالہا سال تک یہی کیفیت رہی حالانکہ مَیں کسی جانی دشمن سے بھی بات چیت کا سلسلہ بند نہیں کیا کرتا۔ اور مولانا تو بچپن کے دوست تھے لیکن مولانا کی آزردگی نہ گئی۔ پہلے لکھ چکا ہوں کہ مولانا لاہور میں زیادہ تر ہندوؤں اور سکھوں سے تعلّقات رکھتے تھے۔ مسلمانوں سے چنداں واسطہ نہ تھا اور دیوبند کے عالم ہونے کے باوجود غیر شرعی ڈاڑھی اور آزادانہ روّیہ کی وجہ سے ایک دفعہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ان پر ناراض بھی ہوئے تھے۔ انجمن خُدام الدّین کے اجلاس پر یہ بزرگ تشریف لائے تو مولانا انور شاہ نے فرمایا کہ ہمارے دارالعلوم کا عالم اور حلیہ یہ! تم نے پڑھ لکھ کر کھو دیا اور دارالعلوم کو بدنام کیا۔ مولانا سر جھکائے سب کچھ سنتے رہے اور اف نہیں کی۔ تھوڑی دیر میں اٹھ کر چلے آئے۔

مولانا کی ادبی صحافت

اس میں شک نہیں کہ مولانا تاجور نے اپنی دیوبندی تعلیم سے نہ کوئی فائدہ خود اٹھایا نہ دوسروں کو پہنچایا۔ انہوں نے عمر بھر فارسی پڑھا کر معاش پیدا کی اور اردو ادب و شعر کی خدمت میں مصروف رہے۔ مولانا کی تصانیف صرف چند غزلوں نظموں اور رسالوں تک محدود ہیں۔ ان کے سکولی اور کالجی شاگردوں کے علاوہ زبان وفن میں بھی ان کے تلامذہ کی تعداد خاصی ہے۔ جن کی اکثریت ہندوؤں اور سکھوں

پر مشتمل تھی۔ انہوں نے "مخزن" اور "ہمایوں" کی ادارت کی۔ اس کے بعد "ادبی دنیا" اور شاہکار جاری کئے۔ بچوں کا رسالہ "پریم" جاری کیا۔ غرض پوری زندگی ادب۔ شعر اور صحافت میں صرف کی۔ سر سکندر حیات خاں کی وزارت کے زمانے میں راجا نرندر ناتھ اور بعض دوسرے ہندو بزرگوں کی تحریک پر حکومت پنجاب نے مولانا کو "شمس العلماء" کا خطاب دلوایا۔ لیکن مولانا کو بڑھاپے میں دو پلے پلائے فرزندوں کے انتقال کا جو صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کے بعد ان کی صحت بالکل سنبھل نہ سکی۔ جسم تو پہلے ہی دوہرا تھا لیکن آخری عمر میں بہت بھاری ہو گئے تھے اور پیٹ میں سانس نہ سماتا تھا۔ بعض دوسرے عوارض بھی لاحق ہو گئے تھے۔ آخر چھیاسٹھ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

سلسلہ کلام کی تجدید

لکھ چکا ہوں کہ مجھ سے سلسلہ کلام منقطع تھا۔ لیکن اس انقطاع کے باوجود ہم دونوں کے قلوب ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف تھے اور تکدّر کا کہیں نام بھی نہ تھا یہ محض ضد اور وضع کا معاملہ تھا۔ جس کی وجہ سے ہم مصالحت نہ کر سکے۔ سچ پوچھئے تو یہ ہم دونوں کی حماقت تھی۔ انتقال سے چند ماہ پیشتر ایک دن یونیورسٹی کے دفتر کے سامنے کھڑے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ بھری سی ترشی ہوئی داڑھی جس میں باقاعدہ خضاب کرتے تھے۔ شیروانی اور آڑا پاجامہ پہنے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی لئے کھڑے تھے۔ مجھے انہیں دیکھ کر کشش ہوئی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ مدة العمر کے دوست۔ ہم ذوق۔ استاد بھائی اور راہ ادب کے ہمسفر تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر بے تکلف اپنی چھڑی سے ان کی توند

پر ہٹھو کا دیا اور کہا۔ "کیا حال ہے مولوی"۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجھے بڑے زور سے لپٹا لیا۔ کہنے لگے "کم بخت۔ ساری عمر ضد میں ضائع کر دی"۔ میں نے کہا "میں اور ضد؟" کیا میں کوئی نجیب آبادی روہیلا ہوں کہ ضد پر پوری عمر قربان کر دوں۔ یہ سب تمہارا اڑیل پنا تھا ورنہ میں تو ہر وقت ملنے کے لئے تیار تھا۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اور پُرانے دوستوں کی باتوں میں جو خاص لذّت اور خاص اشارات ہوتے ہیں وہ اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے بعد دو تین دفعہ اسی طرح سرِ راہ ملے۔ یہاں تک کہ ایک دن یہ سن کر دل بیٹھ گیا کہ تاجور بھی رخصت ہوئے۔

پنڈت ہری چند اختر میر کا یہ شعر یوں پڑھا کرتے تھے۔ ؎

اے حبِ جاہ والو۔ جو آج تاجور ہے
کل اس کو دیکھنا تم نے تاج ہے نہ تور ہے

انہوں نے بھی مولانا تاجور کی موت کی خبر سنی تو پندرہ منٹ تک بالکل مبہوت بیٹھے رہے۔ اور پھر مولانا کی محبّت۔ ان کی عداوت۔ ان کے جھگڑوں۔ ان کے رسالوں۔ ان کے شعر اور ان کی ایڈیٹری کی باتیں جو چلیں تو گھنٹوں گزر گئے۔

چراغ حسن حسرت

۱۹۲۷ء کا ذکر ہے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ کلکتے میں ایک بزرگ سے بہت ضروری کام ہے۔ اگر وہاں آپ کے کوئی جاننے والے ہوں تو ان کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر مجھے دیجئے تاکہ کلکتے جا کر حصولِ مرام کی کوشش کروں۔ میں نے کہا۔ کلکتے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے اور اس قسم کے کام کے لئے مولانا کو تکلیف دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا البتہ ایک شخص چراغ حسن حسرت کاشمیری ہے جو کلکتہ کے روزنامہ "نئی دنیا" میں کولمبس کے نام سے افکار و حوادث جیسا کالم لکھتا ہے۔ اس کی تحریر کے بانکپن سے معلوم ہوتا ہے کہ میری اور اس کی روحیں اس دنیا میں آنے سے پہلے کہیں ملی ہیں اور ان کے

درمیان گہرے تعلقات رہے ہیں۔ اس کا ذوق ادب و مزاج یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بہت ہی پیارا اور پیار کرنے والا انسان ہوگا۔ خشک طبع اور بے مروت نہ ہوگا۔

دوست نے کہا کہ اگر آپ کو ایک ناآشنا پر اتنا ہی بھروسہ ہے تو اسی کے نام خط لکھ دیجئے۔ چلیئے یہ ایک تجربہ ہی سہی۔ مَیں نے حسرت کے نام خط لکھ دیا۔ اور دوست اسے لے کر کلکتے چلے گئے۔ حسرت صاحب نے میرے دوست کی مخلصانہ پذیرائی کی۔ اٹھ کر خود ساتھ گئے اور ان کا کام بالکل احسن اور اطمینان بخش طریق پر انجام دے دیا۔ یعنی میرا اندازہ جو اتنی دور سے لگایا گیا تھا سو فیصدی دُرست نکلا۔

حسرت لاہور میں

اس واقعہ کو ایک آدھ مہینہ ہی گزرا ہوگا کہ ایک دن ایک بالا بلند۔ گندمی رنگ کالی اور گھنی مونچھوں والا آدمی سوٹ پہنے ہوئے دفتر "انقلاب" میں مجھ سے ملنے آیا۔ اور کہنے لگا۔ میں چراغ حسن حسرت ہوں۔ مَیں اچھل کر یوں بغل گیر ہوا۔ گویا ہم بچپن کے ساتھی اور دوست تھے۔ پوچھا آپ یہاں کہاں؟ کہنے لگے مَیں تو کلکتہ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ لیکن مولوی ظفر علی خاں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے کہلوایا کہ "زمیندار" میں چلے جاؤ۔ مولانا کا حکم میرے لئے واجب التعمیل تھا۔ لہٰذا چلا آیا ہوں اور چند روز سے "زمیندار" میں کام کر رہا ہوں۔ دوران گفتگو میں حسرت نے کہا۔ سالک صاحب تعجّب ہے زمیندار والوں سے آپ کی ان بن کیوں ہوگئی۔ مولوی صاحب اور اختر دونوں ہی بڑے پاک اور محبت پرور ہیں۔ مَیں نے کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں اور اسی وجہ سے مَیں نے "زمیندار" میں سات سال گزار دیئے۔ لیکن اب

وہ پرانی کیفیت نہیں رہی۔ آپ بھی بہت زیادہ خرمی کا اظہار نہ کیجئے۔ ؎

چو می بینم کسے از کوئے او دلشاد می آید

فریبے کز وے اوّل خوردہ بودم یاد می آید

ابھی حسرت صاحب نے ایک آدھ مہینہ ہی "زمیندار" میں کام کیا تھا کہ تپ محرقہ نے آن گھیرا۔ پردیس کا معاملہ۔ کس مپرسی کے عالم میں پڑے رہتے۔ نہ کوئی خبر لیوا نہ پانی دیوا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ "زمیندار" سے واجبات بھی وصول نہ ہوتے۔ پھر وہ دوبارہ زمیندار میں نہیں گئے۔

دار الاشاعت میں

میں نے گلاب چند کپور پبلشرز سے کچھ درسی کتابوں کی نظر ثانی کا کام حسرت صاحب کو دلوایا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولوی ممتاز علی کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کو مدت سے اپنے اخباروں کے لئے کسی موزوں ایڈیٹر کی تلاش ہے۔ آپ چراغ حسن حسرت کو رکھ لیجئے۔ وہ بے حد موزوں رہیں گے۔ اعلیٰ درجے کے زباں داں اور تجربہ کار صحافی ہیں۔ چنانچہ مولوی صاحب نے حسرت صاحب کو وہی اسامی دے دی۔ جس پر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک میں کام کرتا رہا تھا اور "پھول" اور "تہذیب نسواں" کی ترتیب میں ان سے مدد لینے لگے۔ اس تقرر سے چند روز پہلے چند ہفتوں کے لئے حسرت نے "بندے ماترم" میں بھی کام کیا۔ لیکن اس کو حکومت نے بند کر دیا تھا۔

پھر اخبار نویسی

اس کے بعد حسرت صاحب کی مطمئن زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ لیکن دو سال گزرنے پر پھر روزانہ اخبار نویسی کا دورہ پڑا۔ اور احسان، شہباز۔ انصاف وغیرہ میں کام کرتے رہے۔ اس دوران میں اپنا دلکش ہفتہ وار "شیرازہ" بھی نکالا۔ جو اپنی وضع کا ایک ہی ادبی ونکاہی رسالہ تھا اور بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ سردار سکندر حیات خاں کی وزارت کے زمانے میں اگرچہ حسرت نے اتحاد پارٹی پر بہت مزے مزے کی چوٹیں کی تھیں۔ لیکن جب حکومت پنجاب نے "پنچایت" اخبار نکالا تو حسرت صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اور اس کے بعد دوران جنگ عظیم میں فوج کے محکمۂ تعلقات عامہ میں بھرتی ہو کر سنگاپور چلے گئے۔ میجر کی رینک تک پہنچے اور اختتام جنگ پر لاہور میں آکر امروز کے "ایڈیٹر" مقرر ہوتے۔

عرب ہوٹل

میرے ساتھ حسرت کے تعلقات ہمیشہ گہرے دوستانہ و برادرانہ رہے ہم مذاقی کی وجہ سے کبھی اختلاف کی نوبت نہ آئی۔ اس دوران میں حسرت "عرب ہوٹل" (متصل اسلامیہ کالج) کی بالائی منزل میں رہتے تھے اور ہوٹل میں ان کی مجلس جمتی تھی جہاں بعض احباب اور اسلامیہ کالج کے طلبہ ان کے گرد جمع رہتے اور ان کی ادبیت اور لطیفہ بازی سے محظوظ ہوتے۔ شادی ہو جانے کے بعد انہوں نے علیحدہ مکان لے لیا لیکن پھر بھی کبھی کبھی عرب ہوٹل آجایا کرتے تھے۔

اسلوبِ انشا

زبان کے معاملے میں محاورہ اہل زبان کی پابندی حسرت کے لئے مذہب کا حکم رکھتی تھی۔ مَیں بھی اس بارے میں کافی محتاط ہوں۔ لیکن حسرت صاحب سے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ "ماڈرن" اُردو لکھا کرو۔ طلسم ہوشربا اور فسانہ آزاد کی اُردو بلاشُبہ پاکیزہ ہے۔ لیکن زبان کوئی کھڑے پانی کا جوہڑ نہیں۔ بہتا دریا ہے۔ زمانہ حال میں اظہار و بیان کی ضرورتیں متقاضی ہیں کہ کچھ نئے محاورے نئی ترکیبیں اور جملوں کے نئے انداز اختیار کر لئے جائیں۔ لیکن حسرت اپنے مسلک سے ایک انچ بھی انحراف کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ متین و سنجیدہ۔ مزاحیہ۔ خالص ادبی و روحانی ہر قسم کی نثر لکھتے تھے۔ غزل بے حد پاکیزہ کہتے تھے۔ اور قواعدِ زبان اور اسالیبِ فن کی پوری پابندی کرتے تھے۔ ان کی مزاحیہ تحریروں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ الفاظ کے عجیب پہلو نکال لیتے اور بات میں بات پیدا کرتے۔ لطائف بہت کم بیان کرتے۔ لیکن احوال و واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے چُٹکلوں کی بھرمار کر دیتے۔ مختلف علوم کے مبادی سے واقف تھے۔ اور تاریخ سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ ان کی روزمرہ کی تحریریں پڑھنے سے ان کی وُسعتِ معلومات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہیں کسی مرض یا علاج کا ذکر ہے تو طب کی اصطلاحات کا انبار لگا رکھا ہے۔ فلسفہ و حکمت کا کوئی مسئلہ بیان ہو رہا ہے تو افلاطون و ارسطو سے لے کر کانٹ اور ہیگل تک کا تذکرہ یوں کیا جا رہا ہے گویا فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ کسی تاریخی مسئلہ پر بحث ہے تو نہایت مستند معلومات پیش کی جا رہی ہیں۔ گو ان علوم میں درخورِ دانی نہ

رکھتے ہوں۔ لیکن تحریر کی رنگا رنگی اور معلومات کی جمع آوری سے پڑھنے والے مرعوب ضرور ہو جاتے تھے۔

کافی ہاؤس

"عرب ہوٹل" کے بعد حسرت کی نشست "کافی ہاؤس" میں منتقل ہو گئی۔ ان کی عادت تھی کہ ہم نشینوں میں سے کسی کی ذرا سی غلط بات کو بھی نظر انداز نہ کرتے اور اُلجھ جاتے۔ مَیں ان کو نوجوانوں سے بحث کرتے دیکھتا تو کہتا۔ حسرت صاحب ان لڑکوں کی باتوں پر نہ جائیے۔ ایک تو ان کی معلومات کم۔ دوسرے یہ آپ سے باتیں سننے کے لئے آپ کو جان بوجھ کر مشتعل بھی کرتے ہیں اور آپ ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن حسرت ہرگز خاموش نہ رہتے اور اکثر اچھی خاصی ہنگامہ آرائی کا سامان پیدا ہو جاتا۔ لیکن نوجوان ان سے محبت بھی بے حد کرتے۔ کیونکہ حسرت صاحب کے دل میں کسی کی طرف سے ذرا سی کدورت بھی باقی نہ رہتی تھی اور خلوص و محبت کے تعلقات لڑائی کے چند لمحوں ہی کے بعد دوبارہ قائم ہو جاتے۔

پابندیٔ وضع

"امروز" میں انہوں نے جس محنت سے کام کیا۔ نوجوان رفقائے کار کی تربیت جس شفقت سے کی اور پھر انہی کی خاطر سات سو روپے کی نوکری پر جس بے نیازی سے لات ماردی وہ اب تک احباب کے حافظے میں تازہ ہے۔ مالکِ اخبارِ امروز

ایوب احمد کرمانی (نائب مدیر) کو علیحدہ کر رہے تھے۔ حسرت صاحب اس علیحدگی کے مخالف تھے۔ مالک نے ضد کی۔ اور اپنے استحقاق پر زور دیا۔ حسرت بحیثیت مدیر اپنے اختیار پر مُصر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آٹھ رفیقوں کو ساتھ لے کر امروز سے الگ ہو گئے۔ اور اختیاراتِ ادارت کے معاملے میں مفاہمت پر آمادہ نہ ہوتے۔

کراچی میں ریڈیو کے محکمے نے ان کو بارہ سو روپے ماہانہ "پرنیشنل پروگرام" کی ترتیب سپرد کی۔ چھ ماہ کے بعد وہ پروگرام موقوف کر دیا گیا اور حسرت صاحب نے امریکن پبلشنگ کمپنی سلور برڈٹ" کی درسی کتابوں کے ترجمے کا کام سنبھالا۔ جسے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس کام کے اختتام پر لاہور آ گئے۔ ڈیڑھ سال عوارض قلب میں مبتلا رہے۔ ساری جمع پونجی ختم ہو گئی اور ناداری میں انتقال کیا۔ آخری چند ماہ "نوائے وقت" میں "حرف و حکایت" کا کالم لکھتے رہے اور اسی کے معاوضے پر معیشت کا مدار رہا۔

حسرت اور ترنم

شاعر بہت اچھے تھے لیکن مشاعروں میں پڑھنے سے گریز کرتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ ان کی آواز صرف احباب کی محفلوں میں شعر سنانے کے قابل ہے۔ مجمع عام میں اس کا اثر اچھا نہ پڑے گا اور حاضرین مشاعرہ جن میں اکثریت بے عنان نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ غل مچا کر ان کے کلام کو غارت کر دیں گے۔ حسرت صاحب کی آواز بھاری تھی۔ تحت اللفظ خوش آئند طریق پر پڑھتے تھے۔ البتہ ترنم کی کوشش میں بدآہنگ ہو جاتے تھے۔ پرائیویٹ صحبتوں میں ہم لوگ اصرار کر کے ان سے عربی اور فارسی انشاد

کی نقل سنا کرتے تھے جو بے حد سامعہ فرسا لیکن نہایت قہقہہ انگیز ہوتی تھی۔ مجلس میں عام طور پر خاموش بیٹھے رہتے تھے اور یہ مُہرِ سکوت دو ہی حالتوں میں ٹوٹتی تھی۔ ایک اس وقت جب کوئی نوجوان ادب و شعر کے معاملے میں کوئی خامکارانہ رائے ظاہر کرتا۔ دوسرے اس وقت جب حسرت صاحب عالمِ کیف میں ہوتے اور خواہ مخواہ بولنے اور بنکارنے کو جی چاہتا تھا۔

جدید شاعری کے مخالف تھے۔ چنانچہ اس کے متعلق ان کی "پیروڈیاں" مشہور ہیں۔ "امروز" میں تین سال ایڈیٹری کرنے کے باوجود وہ کمیونزم۔ ترقی پسند۔ ادب اور دوسرے جدید رجحانات کو کبھی سو فیصدی اپنا نہ سکے بلکہ اپنے خیالات و عقاید پر پختگی کے ساتھ قائم رہے یہاں تک کہ جب "اوپن ایر تھیٹر" میں جنگجو ترقی پسندوں کی کانفرنس حسرت صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جب بھی خطبۂ صدارت میں انہوں نے اپنی انفرادیت اور قدامت پسندی کا صاف اعلان کر دیا۔ وہ "امروز" کو اپنے مسلک کے مطابق مرتب کرتے تھے۔ اور اس معاملے میں میاں افتخار الدین کی رائے کو بھی غیر مشروط طور پر ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔

"ظہیر الحسن اور پیر سعید"

"امروز" کی ایڈیٹری کے زمانے میں حسرت کو ایک شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بد بخت "پیر" سعید ان کے صاحبزادے ظہیر الحسن کو ورغلا کر لے گیا۔ اور حسرت صاحب اپنے لختِ جگر کی تلاش میں خدا جانے کہاں کہاں ٹکریں مارتے پھرے۔ پیر سعید اور اس کے ساتھیوں کے متعلق ہولناک واقعات سننے میں آتے تھے۔

مثلاً یہ کہ وہ نو عمر بچوں کو متاثر کر کے ان سے چوری وغیرہ کراتا ہے اور جس وقت کوئی خطرہ کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ان کو ہلاک کر کے کسی جنگل میں دفن کر دیتا ہے۔ حسرت صاحب اور بیگم حسرت کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ گیارہ بارہ سال کا اکلوتا بیٹا غائب ہو گیا تھا اور قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مارا جا چکا ہے۔ آخر دوستوں کی دعاؤں اور کوششوں سے حسرت صاحب بچے کو تلاش کرتے کرتے ایسے مقام پر جا پہنچے جہاں پیر سعید بھی موجود تھا اور بچہ بھی اگر ایک آدھ گھنٹہ اور حسرت صاحب وہاں نہ پہنچتے تو وہ بچے کو ہلاک کر چکا ہوتا بچے کو گھر لائے۔ پیر سعید کے خلاف مقدمہ چلا۔ جس میں بڑے خوفناک انکشافات ہوئے۔ آخر وہ پھانسی پر لٹک کر کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے صرف ظہیر الحسن ہی کی جان نہ بچائی بلکہ حسرت صاحب کو ایک اور فرزند بھی عطا فرمایا۔

توبۃ النصوح

حسرت کو مدۃ العمر ناؤنوش کے مشاغل سے واسطہ رہا۔ اور سگرٹ تو وہ دن بھر میں سو سو پی جاتے تھے۔ ان بے اعتدالیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے۔ پہلے بھی کبھی کبھی دورہ پڑ جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۵۳ء کے اواخر میں جب وہ کراچی سے لاہور آ گئے۔ تو ایک آدھ مہینے کے بعد انہیں بخار ہوا۔ جو ٹائیفائڈ ثابت ہوا اس ٹائیفائڈ کے دوران میں پھیپھڑوں پر نمونیا کا اثر بھی ہو گیا اور ایک دن دفعتہً عارضہ قلب (تھروم بوسس) کا دورہ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالت نازک ہو گئی۔ میو ہسپتال میں داخل کئے گئے اور ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے انتہائی توجہ اور محنت سے

علاج شروع کیا۔ فروری ۱۹۵۴ء میں میں بھی کراچی سے واپس آگیا۔ جب حسرت کو دیکھنے گیا۔ تو بے ہوش تھے۔ آکسیجن دی جا رہی تھی اور ڈاکٹر کچھ زیادہ پُر امید نہ تھے لیکن دوسرے تیسرے دن گیا تو ہوش میں تھے۔ کہنے لگے سالک صاحب آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں نے آپ کا احترام اور ادب ہمیشہ بزرگ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ میرے لئے دعا کیجئے۔ میں نے کہا۔ اگر آپ ناؤ نوش کے مشغلے سے توبہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دے دے گا۔ اس پر نہایت خلوص دل سے توبہ کی اور کہا۔ اور تو اور میں عمر بھر سگریٹ تک نہ پیوں گا۔ اس دن سے حسرت صاحب کی حالت روز بروز بہتر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دو ماہ کے اندر وہ تندرست ہو کر ہسپتال سے گھر چلے آئے۔

اس میں شک نہیں کہ حسرت صاحب کی یہ توبہ توبۃ النّصوح تھی۔ اس کے بعد انہوں نے سگریٹ تک نہیں پیا۔ کافی ہاؤس میں آتے۔ لیکن کافی نہ پیتے۔ کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے کی نوش کرتے اور کھانے میں پرہیز و احتیاط بدرجۂ اتم کرتے۔ یہ صورت تادمِ مرگ قائم رہی۔

ایک لمحے میں انتقال

ایک تو قلب کا عارضہ۔ دوسرے روپے پیسے کی قلت۔ تیسرے عزیزوں اور مہمانوں کی آؤ بھگت۔ چوتھے یومِ آخر سے پندرہ دن پہلے ظہیر الحسن کا بلا اجازت گھر چھوڑ کر چلے جانا اور پندرہ دن تک غائب رہنا۔ ان وجوہ سے حسرت کی موت کا دن قریب تر ہو گیا۔ اور ایک دن جب وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے فرزند ظہیر الحسن

کے ساتھ ہی قیلولہ کر رہے تھے۔ بے چین ہو کر اٹھے۔ ایک لمبا سانس لیا۔ اور وہ ان کا آخری سانس تھا۔

ایک باوضع انسان۔ بامروت دوست
بلند پایہ انشا پرداز۔ زبان دان اور شاعر
نامور اخبار نویس اور محفل آرا آدمی صرف
پچاس برس کی عمر میں ہماری مجالس کو
سونا کر گیا اس کی یاد مدتوں تک دلوں کو
تڑپاتی رہے گی۔

ڈاکٹر تاثیر

بیسویں صدی کے آغاز میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دو طبقے تھے۔ ایک وہ جو علوم والسنہ مشرقیہ میں درخور وانی رکھتے تھے۔ لیکن انگریزی زبان اور علوم حاضرہ سے بالکل بیگانہ تھے۔ دوسرا طبقہ ان جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ جو انگریزی کے بغیر ٹکڑا نہ توڑتے تھے۔ اور اردو فارسی۔ عربی کے ذخائر ادبی کی افادیت سے منکر اور دینیات سے بیگانہ محض واقع ہوتے تھے۔ دیوبند اور علی گڑھ ان دونوں طبقوں کے مرکز تھے۔ علی گڑھ کے پڑھے لکھے تو پھر بھی کسی حد تک مشرقیت کا دم بھرتے تھے لیکن مدارس دینیہ کے فیض یافتہ علوم جدیدہ اور حالات حاضرہ کے تقاضوں سے بالکل ہی ناآشنا تھے۔ ڈاکٹر اقبال غالباً پہلے نمایاں اور ممتاز نوجوان تھے جو اس معاملے میں مجمع البحرین

کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ایم۔اے پی۔ ایچ ڈی اور بیرسٹر کے ساتھ ہی ساتھ مشرقی علوم والسنہ اور دینیات کے بھی بدرجۂ اتم ماہر تھے۔ ان کے نقشِ قدم پر چل کر پنجاب کے جن نوجوانوں نے علم کے ان دونوں پہلوؤں سے بیک وقت رابطہ استوار کیا۔ ان میں خلیفہ عبدالحکیم۔ سیّد احمد شاہ بخاری اور ڈاکٹر تاثیر کے نام ممتاز ہیں۔

نیرنگ خیال میں

حکیم یوسف حسن صاحب نے رسالہ "نیرنگِ خیال" جاری کیا۔ تو ابتدا ہی سے اس کی ایک خصوصیت نمایاں ہوئی کہ اس میں عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر اور ان پر محمد دین تاثیر ایم۔ اے کے تنقیدی و تعارفی نوٹ شائع ہوتے تھے۔ اس سے قبل میں نے رسالہ "الناظر" (لکھنو) میں بعض ادبی مسائل پر "محسن تاثیر ایم اے از لاہور" کے مضامین پڑھے تھے۔ لیکن مضمون نگار کا سراغ نہ مل سکا تھا۔ ایک دن میں نے سیّد احمد شاہ بخاری سے پوچھا کہ یہ محمد دین تاثیر کون صاحب ہیں: پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ تاثیر خاص قابلیتوں کا نوجوان ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک آپ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ چلئے ابھی تاثیر کے ہاں چلیں۔ چنانچہ ہم محلہ بارود خانہ میں میاں نظام الدّین مرحوم کے دولت کدہ پر گئے۔ وہاں ایک بالاخانے پر تاثیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک موٹے موٹے خدوخال کا جوان بے پروا نظر آیا۔ جس کی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت سے خلوص ٹپکتا تھا۔ گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ مطالعہ بے حد وسیع ہے اور صرف مغربی ادب و فن ہی تک محدود نہیں بلکہ اُردو اور فارسی کے ذخائر علم و ادب میں بھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ عبدالرحمٰن

چغتائی کے آرٹ کا تعارف اردو دان طبقے سے تاثیر ہی نے کرایا اور مضامین لکھ لکھ کر لوگوں کو آرٹ کے جدید رجحانات کی طرف توجہ دلائی۔

انگلستان میں

اس کے بعد اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ جس زمانے میں علامہ عبداللہ یوسف علی اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے تاثیر صاحب ان کے ماتحت انگریزی ادب کے لکچرر مقرر ہوتے اور اپنی دلآویز شخصیت۔ شعر و شاعری اور تدریسی قابلیت کی وجہ سے طلبہ میں بیحد مقبول ہو گئے۔ کچھ مدت بعد مزید تعلیم کے لئے کیمبرج (انگلستان) چلے گئے۔ اور وہاں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے آئے۔ یورپ میں قیام کے دوران میں جن احباب کو طویل طویل خطوط سے نوازتے تھے۔ ان میں مَیں بھی شامل تھا۔ اس زمانے میں تاثیر پر اشتراکیت اور ترقی پسندی کا بہت غلبہ تھا لیکن اظہار خیالات میں کبھی حدود سے تجاوز نہ کرتے تھے۔

اقبال نے نکاح پڑھایا

انگلستان سے واپس آئے تو ڈاکٹریٹ کے علاوہ ایک خاتون بھی ساتھ لے آئے۔ جن سے ازدواج طے ہو چکا تھا۔ میاں نظام الدین مرحوم پرانے وضعدار بزرگ تھے۔ اس معاملے پر جز بز تو ہوتے لیکن علامہ اقبال کے سمجھانے سے رضامند ہو گئے۔ اور ڈاکٹر تاثیر کا نکاح کرسٹابل کے ساتھ ڈاکٹر اقبال نے خود پڑھایا۔ ڈاکٹر تاثیر ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل مقرر ہوتے۔ وہیں فیض احمد فیضؔ لکچرر ہوتے۔ امرتسر ہی میں

فیض اور ایلس کی شادی ہوئی۔ اور تاثیر اور فیض ایک دوسرے کے ہم زلف بن گئے۔

جنگی نشریہ

جنگ کے زمانے میں برلین (جرمنی) سے جنگی خبروں پر اُردو میں تبصرہ نشر ہوا کرتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو نے قرار دیا کہ ہفتے میں ایک دفعہ یہاں سے اس تبصرے کا جواب "ڈھول کا پول" کے عنوان سے دیا جائے۔ قرعۂ فال ڈاکٹر تاثیر کے نام پر پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ اسی دوران میں وہ سری پرتاب کالج سری نگر کے پرنسپل مقرر ہوتے۔ اور یہ فرض میرے سپرد ہوا۔ اب اس تقریر کا عنوان "برلین کی خبریں" تھا۔ اور ملک بھر میں اس تقریر کا چرچا ہوا کرتا تھا۔

سیاسی طور پر مشتبہ

سر سکندر حیات خاں کی وزارت کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر کی اسامی خالی ہوئی۔ تاثیر نے کہا کہ اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے چنانچہ میں نے اور مہر صاحب نے میاں عبدالحئی وزیر تعلیم اور سر سکندر کو تاثیر کے حق میں قائل کرنے کی شدید کوشش کی۔ اور تین چار دن صبح سے شام تک اسی چکر میں رہے۔ آخر سر سکندر نے کانفیڈنشل طور پر ہمیں بتایا کہ تاثیر صاحب کے متعلق بین الاقوامی نظام خفیہ کی رپورٹ اچھی نہیں ہے اور کمیونسٹ مفکروں اور کمیونسٹ مطبوعات سے ان کا تعلق گہرا بتایا جاتا ہے۔ اس لئے انگریز انہیں گورنمنٹ کالج میں ملازمت دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہ سن کر ہم خاموش ہو گئے اور ڈاکٹر لطیف (صوبہ سرحد) گورنمنٹ کالج میں لے لئے گئے۔

محبِّ وطن تاثیر

پاکستان قائم ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر تاثیر کمیونزم اور ترقی پسند ادب کی لیڈری سے برگشتہ ہو چکے تھے۔ اور اپنے بعض احباب مخلص کے ساتھ مل کر بعض خدمات قومی بھی انجام دے رہے تھے۔ مثلاً انہوں نے شیخ محمد عبداللہ (قائد کشمیر) اور قائدِ اعظم کی ملاقات کرانے کے لئے بے حد محنت کی اور فریقین کو آمادہ کر لیا۔ لیکن آخر میں دونوں نے بعض "اصولوں" کے پیشِ نظر ملاقات سے پہلو تہی کر کے تاثیر کو سخت مایوس کر دیا۔ کشمیر کے لیڈروں کے ساتھ تاثیر کے گہرے تعلقات تھے اور وہ اکثر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ڈاکٹر تاثیر نے "پاکستان مبارک" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین "پاکستان ٹائمز" میں لکھا جس کے لفظ لفظ سے ان کی حُبِّ وطن اور تعمیری ذہنیت کا ثبوت ملتا ہے۔

زبان میں آزادانہ روش

تاثیر کی شاعری میں جدید و قدیم کا نہایت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ ابتدائی غزلوں میں ان کا مخصوص رنگ تو موجود ہے لیکن بعض مقامات پر زبان خلافِ محاورہ ہو گئی ہے۔ اور کہیں کہیں فن کے تسامحات بھی پائے جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ انہیں ان باتوں پر ٹوکا کرتا تھا۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ کیونکہ آجکل کے ادیبوں اور شاعروں کی خود رائی کا کچھ اثر ان میں بھی تھا یعنی غلطی کرتے تھے۔ جان بوجھ کر کرتے تھے اور پھر اس کی صحت پر اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ مجھ سے کہنے

لگے ۔ سالک صاحب ۔ کیا "ہم نے جانا ہے" "ہم نے کرنا" لکھنا درست ہے ؟ میں نے کہا ۔ خلافِ محاورۂ اہلِ زبان ہے ۔ "مجھ کو جانا ہے اور مجھ کو کرنا ہے" ۔ درست ہے ۔ کہنے لگے میں نے اپنی تحریروں میں متعدد بار اس قسم کے فقرے لکھے ہیں ۔ اگر کوئی اہلِ زبان اعتراض کرے تو اس کو کیا جواب دوں ؟ میں نے کہا غلطی کا جواب کیا ہوگا ۔ صاف کہئے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ۔ ہنس کر کہنے لگے ۔ "نہیں ۔ میں صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ایسا جواب دے سکوں جو بظاہر معقول ہو" ۔ میں نے کہا ۔ بھائی ۔ غلطی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے جو جواب دیا جائے گا وہ تو محض سخن طرازی اور کج بحثی ہوگی ۔ کہنے لگے کچھ بھی ہو ۔ آپ اس کا جواب مجھے بتا دیجئے ۔ میں نے کہا ۔ آپ یہ کہئے کہ "نے" علامتِ فاعلی ہے اور "کو" علامتِ مفعولی ۔ اگر "جانا ہے" کا فاعل "میں" ہے تو اس کے بعد "نے" ہی درست ہے ۔ "کو" کیونکر درست ہو سکتا ہے ۔ سن کر اچھل پڑے ۔ اور کہا بس ٹھیک ہے ۔ اب میں جواب دے لیا کروں گا ۔ میں نے کہا ۔ شوق سے دیجئے ۔ لیکن محاورے کے اعتراض کا جواب قواعد سے اور قواعد کے اعتراض کا جواب محاورے سے دینا اصولِ لسانیات سے تو درست نہ ہوگا ۔

ہزار پہلو شخصیت

تاثیر بے حد روشن طبع اور عالی دماغ آدمی تھے ۔ ان کی ذہانت و طبّاعی بے مثال تھی ۔ شاعروں میں شاعر ۔ فلسفیوں میں فلسفی ۔ ادیبوں میں ادیب ۔ نقّادوں میں نقّاد معلّموں میں معلّم اور صرف یہی نہیں بلکہ رِندوں میں رِندِ لم یزل ۔ مجلسِ یاراں میں

بریشم کی طرح نرم ۔ اور لڑائی میں فولاد کی طرح سخت ۔ معاصرانہ نوک جھونک اور کشمکش و چپقلش کے عاشق ۔ ان کی ظرافت محفل آرا تھی اور طنز بے پناہ ۔ شعر و سخن میں پرانے انداز و تخیل کی خوبیوں کے بھی دلدادہ ۔ اور نئے اسالیب فکر اور جدید طریقہائے اظہار کے بھی قدر دان ۔ ادب اور آرٹ کی تنقید میں انہوں نے اردو کے انشا پردازوں کو نئے راستے دکھائے اور ان کے روابط صرف شاعروں اور ادیبوں ہی تک محدود نہ تھے ۔ بلکہ ماہرینِ تعلیم ۔ ارباب سیاست ۔ ارکان صحافت سبھی سے گہری چھنتی تھی اور سبھی ان کی گوناگوں قابلیتوں اور صلاحیتوں کے شیفتہ تھے ۔

زمیندار و انقلاب کی جنگ

ان کا دماغ اور قلم نچلا بیٹھنا نہ جانتا تھا ۔ زندگی میں جمود اور ٹھہراؤ کے قائل نہ تھے ۔ اور کچھ نہیں تو فرضی ناموں سے اخباروں میں کسی کے خلاف مضمون نگاری کر رہے ہیں ۔ نظمیں لکھ رہے ہیں اور ہم قلم لوگوں کو چھیڑ چھیڑ کر خوش ہو رہے ہیں ۔ جس زمانے میں "انقلاب" اور زمیندار کے درمیان تحریری جنگ ہو رہی تھی ۔ تاثیر "انقلاب" کے جھنڈے تلے تھے ۔ اور "نظامی قدوسی ایم اے" کے فرضی نام سے مولانا ظفر علی خاں اور "زمیندار" کے خلاف نہایت چبھتی ہوئی نظمیں لکھ کر "انقلاب" میں چھپواتے تھے ۔

پاکستان قائم ہونے کے بعد جب ڈاکٹر تاثیر اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اکثر اپنے کام سے فارغ ہو کر مجھے ٹیلیفون کرتے اور کہتے ۔ کہ اگر آپ فارغ ہوں

تو ئیں آجاؤں؟ مَیں کہتا تھا۔ بسم اللہ۔ دفتر "انقلاب" میں آ کر بیٹھتے۔ تو گھنٹوں گفت وشنید کا ہنگامہ بپا رہتا۔ بیچاری "کرس" کھانے پران کا انتظار کرتی۔ اور اسلامیہ کالج۔ میاں امیرالدین۔ ایس ایم شریف (ڈائریکٹر تعلیم) یونیورسٹی اور خدا جانے کہاں کہاں ٹیلیفون کر کے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی۔ آخر وہ دفتر "انقلاب" میں ملتے۔ اور پھر ان دونوں کی ٹیلیفونی لڑائی قابلِ دید ہوتی۔ اپنی بچیوں پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ اور گھر میں ان کے ساتھ لاڈ پیار کے بعد مطالعہ وغیرہ کے لئے بہت ہی کم وقت نکال سکتے۔

حسرت اور تاثیر کی نظم بازی

وہ اخباری لڑائی تو بہت سے دوستوں کو یاد ہوگی جو ان کے اور چراغ حسن حسرت کے درمیان ہوئی۔ صرف یہی نہیں کہ تاثیر صاحب کمیونزم اور ان کے متعلقات سے کاملاً برگشتہ ہو چکے تھے بلکہ ان کی مخالفت میں سرگرم تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کمیونسٹ نہ تھے۔ لیکن "امروز" کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے لامحالہ میاں افتخارالدین کی رعایت پر مجبور تھے۔ اگرچہ تاثیر اور حسرت کی دوستی پُرانی اور گہری تھی اور ہم مشربی کی وجہ سے اس میں اور بھی چار چاند لگ گئے تھے۔ لیکن تاثیر کو تو لڑنا تھا۔ خواہ مقابل پر کوئی دوست ہی آ جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نام سے بھی اور بعض فرضی ناموں سے بھی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ جن میں "کمیونسٹ اخبار" اور حسرت اور افتخارالدین پر بے پناہ چوٹیں ہوتی تھیں۔ اُدھر حسرت بھی پرانے پھکیت تھے انہوں نے بھی مقابلے پر دھڑا دھڑ نظمیں جھاڑنی شروع کیں۔ یہاں تک کہ معمولی

سی چھیڑ چھاڑ دو تین ہفتوں کے اندر ہی "گھمسان کا رن" بن گئی۔ تاثیر کی نظمیں زیادہ تر "مغربی پاکستان" اور حسرتؔ کی "امروز" میں چھپتی تھیں۔ لاہور کے "تماشبین اخباربین" دونوں کو پڑھتے اور لطف اٹھاتے تھے۔

متارکہ ہو گیا

جب یہ "مناظرہ" لطیف چوٹوں سے بڑھ کر ذاتی حملوں اور متبذل اشارات تک پہنچ گیا۔ تو ایک دن آغا شورش کاشمیری اور ایک دو اور نوجوانوں نے مجھ سے کہا کہ "اس ناگوار جنگ سے اہل ذوق بیزار ہو رہے ہیں۔ تاثیرؔ اور حسرتؔ دونوں آپ کے دوست ہیں۔ ان کو منع کیجیے"۔ اس وقت تک حسرتؔ نے نظموں کے علاوہ "حرف و حکایت" میں بھی تاثیر کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ انجمن حمایت اسلام سے ان کو اسلامیہ کالج کی پرنسپلی سے موقوف کرانے کی اپیل بھی کر دی تھی۔ میں نے حسرتؔ سے کہا "آپ تو بہت بااصول اور متین صحافت کے دعویدار ہیں۔ آخر یہ "امروز" میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہی سنجیدہ صحافت ہے"۔ وہ بہت بگڑے ہوئے تھے لیکن میرے اصرار پر مان گئے کہ اگر تاثیر باز آجائیں تو "امروز" میں کچھ نہ لکھا جائے گا۔ پھر میں نے تاثیر صاحب سے کہا کہ آپ اتنے عالم و فاضل آدمی۔ ایک کالج کے پرنسپل، اخبار نویس تو اپنی پگڑی رکھتے نہیں اور دوسرے کے سر سے اتارنے میں تامل نہیں کرتے۔ لیکن یہ جنگ و پیکار آپ کی شان کے لائق تو نہیں۔ کہنے لگے۔ آپ حکم دیں گے تو میں نہ لکھوں گا۔ لیکن حسرتؔ اس رعایت کے قابل نہیں ہے۔ پھر میں نے مولانا میکش مدیر "مغربی پاکستان" سے کہا کہ آپ اب اس سلسلے میں کوئی چیز نہ چھاپیے

غرض راتوں رات یہ متارکہ مکمل ہوگیا اور صبح دونوں اخبار اس ناگوار جھگڑے سے پاک تھے۔ تاثیر اور حسرتؔ کی یہ ساری نظمیں آغا شورش نے جمع کرکے "چٹان" میں چھاپ دیں تاکہ اس تاریخی جنگ کا ریکارڈ محفوظ رہے۔

اس کے بعد میرا ارادہ تھا کہ "متارکہ" کے بعد مصالحت بھی کرا دوں تاکہ دونوں دوست گلے مل جائیں۔ لیکن میں سوچتا ہی رہا۔ اور تاثیر ایک دن دفعتہً حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ حسرتؔ کو ان کی موت کا صدمہ خاص طور پر زیادہ ہوا۔ اس لئے کہ وہ تاثیر سے صلح نہ کر سکے اور دونوں کا سلسلۂ کلام و سلام آخر تک منقطع ہی رہا۔

تصنیفات کی قلّت

سب سے زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ تاثیر تصنیف و تالیف کے اعتبار سے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں تہی دست رہے۔ حالانکہ طبیعت کی روانی۔ فکر کی جولانی۔ معلومات کی ہمہ گیری اور تحریر کی سہولت تاثیر کو دوسروں سے بہتر حاصل تھی۔ وہ چاہتے تو ڈھیروں کتابیں لکھ جاتے اور لوگ ان کے علم و فن سے مستفید ہوتے۔ صرف چند چھوٹے چھوٹے تنقیدی مضامین۔ کچھ نظمیں اور غزلیں ان کا سرمایۂ حیات ہیں۔ آخری ایام میں ایک چھوٹا سا ناول لکھا جس کو اپنے نام سے شائع کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن احباب نے اس کو تاثیر ہی کے نام سے شائع کر دیا۔ "آتشکدہ" تاثیر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی کوشش سے مرتّب ہوا۔ اور مسز بلقیس تاثیر نے شائع کر دیا۔

لیکن قلتِ تصانیف کے باوجود ان کا نام اور مقام اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ اس کے نظم و نثر کے قلیل ذخیرے میں بھی ان کے محاسنِ فکری لفظ لفظ سے روشن ہیں۔ تاثیر کے صدہا شاگرد ان کی محبوب یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اور ان کے احباب کا تو یہ حال ہے کہ ممکن نہیں تاثیر کا ذکر آئے اور وہ آبدیدہ نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر اقبال بھی ان کی علمی صلاحیتوں کے مداح و قدردان تھے اور ایک ڈاکٹر صاحب ہی پر موقوف نہیں ملک بھر کے اہل علم تاثیر سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے پچاس برس کی عمر پائی۔ لیکن ان کی فکر کی جوانی۔ طبیعت کی شوخی اور اُچھلاہٹ ان کے بلند قہقہے۔ شعر و موسیقی سے ان کی بے خودانہ لطف اندوزی آخری دم تک قائم رہی۔

مولانا بیدل شاہجہان پوری

۱۹۱۸ء کا ذکر ہے کہ ایک صاحب سید حامد حسین بیدلؔ شاہجہان پوری کہیں سے پھرتے پھراتے لاہور میں آ نکلے۔ حکیم فقیر محمد چشتی کے ہاں ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ مرد جہاں دیدہ ہیں اور علم و ادب میں درخورِ وافی رکھتے ہیں۔ لیکن لاابالی طبع ہونے کی وجہ سے تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ مولانا بیدلؔ اُردو۔ فارسی اور عربی میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی میں شعر بھی پاکیزہ کہتے تھے۔ داغؔ سے تلمذ تھا۔ اور ایک مدت تک ان کے پاس رہ کر اپنے استاد بھائیوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے رہے تھے۔ یعنی نواب فصیح الملک کو اپنے اس شاگرد کے کمالِ فن پر اتنا اعتماد تھا کہ بعض دوسرے شاگردوں کی غزلوں

کو خود بنانے کے بجائے بیدل صاحب کے سپرد کر دیا کرتے تھے اور ان کی اصلاح کو کافی ووافی خیال فرماتے تھے۔

داغ کے علاوہ مولانا شبلی کی خدمت میں بھی مولانا بیدل کو خصوصی نیاز حاصل تھا۔ چنانچہ بیدل صاحب ہی نے اصرار کر کے مولانا سے ان کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ "بوئے گل" مرتب کرایا تھا۔ خود مولانا شبلی نے اس مجموعے کے آغاز میں دو شعر لکھے ہیں۔ جو اس اصرار کا ثبوت ہیں۔ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

ہرزہ چند بہم بافتن و پیش کساں
عرضہ دادن نہ پسندیدۂ عاقل باشد
من ہم ایں کار نمی خواستم از دل امّا
چہ تواں کرد چو فرمودۂ بیدل باشد

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا بیدل اپنے زمانے کے بزرگ ترین اہل علم کی نظروں میں بھی خاص وقعت رکھتے تھے۔

بیدل سے جن دنوں میری ملاقات ہوئی ان کی عمر کوئی پینتالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ وہیں بچپن کا زمانہ گزرا۔ اہل علم کا گھرانا تھا۔ پرانے انداز پر تعلیم وتدریس ہوئی۔ ہوش سنبھالا۔ تو آگرہ کے ایک سکول میں مدرس ہو گئے۔ شادی ہوئی تو دلہن سے محبت درجۂ عشق تک پہنچ گئی۔ لیکن ایک ہی سال بعد اس پیکرِ حسن وخوبی کا انتقال ہو گیا۔ بیدل صاحب کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ ملازمت چھوڑ چھاڑ کر گھر بار کو تج دیا۔ اور جوش جنوں میں نکل کھڑے ہوئے۔ بعض قصبوں اور شہروں میں ان کے

احباب رہتے تھے۔ کچھ مدّت ان کے ہاں بسر کی۔ لیکن یہ سیّاحی کی زندگی پیسے کے بغیر نبھ نہ سکتی تھی۔ چنانچہ بمبئی پہنچے۔ اور بعض دوستوں کی تحریک پر "وی پی سپلائی بزنس" شروع کر دیا۔ اکیلا دم۔ جورو نہ جاتا۔ اللہ میاں سے ناتا۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہنے لگے۔ ادبی آدمیوں سے میل جول تو مذاقِ طبیعت تھا۔ ایسے لوگ بمبئی جاتے۔ یا بیرونِ ہند جاتے ہوتے بمبئی ٹھیرتے۔ تو اکثر بیدؔل صاحب ہی کے ہاں قیام کرتے چنانچہ شیخ سر عبدالقادر بھی دو دفعہ چند روز کے لئے بیدل ہی کے مہمان رہے۔ کبھی مولانا شبلیؔ بمبئی تشریف لاتے تو بیدؔل صاحب ان کے لئے سیر و سیاحت کے گائیڈ کا کام دیتے اور انہیں بمبئی اور مضافات کی دل فریبیوں سے بہرہ اندوز کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ اس کے علاوہ بھی بمبئی باب الہند ہے۔ ملک کے اکثر مشاہیر سے وہاں بیدؔل صاحب کی ملاقات ہو جاتی۔ اور بیدؔل صاحب ان کی خاطر مدارات کر کے ان پر اپنے خلوص اور اپنی ادب نوازی کا سکّہ بٹھا دیتے۔

خدا جانے کیا بجوگ پڑا۔ کہ تیرہ چودہ سال کی اس کامیاب زندگی کا ایک دم خاتمہ ہو گیا۔ کاروبار نفع بخش نہ رہا۔ اور مولانا بیدؔل نے گھبرا کر پنجاب کا رخ کر لیا۔ کہ ملک بھر میں یہی ایک صوبہ اس وقت تک ان کے قدوم میمنت لزوم سے محروم تھا۔ چونکہ ان کے دوست احباب ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور لاہور بھی ان سے خالی نہ تھا۔ اس لئے وہ بے تکلّف یہاں آن پہنچے۔ حکیم فقیر محمد۔ حکیم احمد شجاع سر عبدالقادر۔ خان بشیر علی خاں۔ بشیر حسین خاں اور متعدد دوسرے حضرات ان کو خوب جانتے تھے اور نئے دوست بنانا بھی بیدؔل کے لئے کچھ دشوار نہ تھا۔ چنانچہ جب حکیم فقیر محمد کے ہاں میری ملاقات ہوئی تو بیدؔل نے دفتر پھول و تہذیب نسواں

میں آنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح ان کا تعارف سیّد ممتاز علی۔ سید حمید علی۔ سید امتیاز علی تاج اور آخر الذکر کے احباب احمد شاہ بخاری۔ جگل کشور اب احمد سلیمان سے بھی ہو گیا دن رات صحبتیں رہنے لگیں۔ امتیاز۔ بخاری۔ جگل اور میں نوجوان تھے۔ اور بیدل کی عمر ہم میں سے ہر ایک سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایسے باغ و بہار قسم کے آدمی تھے کہ عالموں اور بزرگوں میں بیٹھتے۔ تو عالمانہ و بزرگانہ باتیں کرتے۔ اور ہماری محفل میں آتے تو لطیفہ بازیاں کرتے۔ معمّے حل کرتے۔ شعر پڑھتے۔ ہزل و فحش نظم کرنے میں بھی بند نہ تھے۔ غرض چند ہی روز میں محسوس ہوا کہ ہماری محفل بیدؔل کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ سالکؔ۔ بخاری۔ امتیاز اور بیدل اس محفل کے چار مستقل عناصر تھے۔ اور گاہ بگاہ شامل ہونے والے احباب ان کے علاوہ تھے۔

بیدؔل صاحب اب تک تو اپنی جمع پونجی پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن ایک دن ایسا آگیا کہ انہیں مطبع مفید عام لاہور میں مصحح کی ملازمت کرنی پڑی اور اس ملازمت کے دوران میں دوسری کتابوں کے علاوہ دیوان غالب کا ایک ایڈیشن بھی خاص محنت سے صحیح و مرتّب کر کے چھپوایا۔ کچھ مدّت بعد مطبع کے کارفرماؤں سے رنج ہو گئی۔ تو ملازمت ترک کر کے گھر بیٹھ گئے۔ دوستوں کو تشویش ہوئی۔ انہی دنوں مولانا تاجور نجیب آبادی نے اپنی دیال سنگھ سکول کی ملازمت کے باعث ادارہ "مُخزن" سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ہم لوگوں نے کوشش کر کے مولانا بیدؔل کو مدیر "مُخزن" مقرر کرا دیا۔ اب ہم سب کی شامت آئی۔ مولانا نے سب دوستوں کے نام مضمون لکھنے کے احکام صادر کر دیتے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات مرتا کیا نہ کرتا۔ سب لکھنے بیٹھ گئے اور مولانا بیدل "مُخزن" کو بڑے سلیقے سے مرتّب کرنے لگے۔ چند مہینے

اس مشغلے میں بھی اچھے بسر ہو گئے۔ لیکن آخر تا کجے۔ مولانا کی سیماب وشی نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ اور ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ الگ ہو گئے۔

مولانا بیدل کی نظم و نثر کا معاملہ مرزا غالب سے مُتضاد تھا۔ مرزا کی نثر سادہ سلیس اور شگفتہ ہوتی تھی۔ اور شعر میں ان کی مشکل پسندی ضرب المثل ہے لیکن بیدل صاحب غزل تو بالکل اپنے استاد مرزا داغ کی زبان میں کہتے تھے اور نثر میں ادق الفاظ اور پیچیدہ جُملوں کے وہ پتھر لڑھکاتے تھے کہ بعض اوقات احباب رعایت خاطرداری کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر مولانا کی نثر کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن چونکہ مولانا ہم سب کے مخدوم و محترم تھے۔ اس لئے ہم سب ان کے حکم کی تعمیل میں "مخزن" کے لئے مضمون لکھ دیا کرتے تھے۔

مولانا بیدل دُبلے پتلے تھے۔ بُوٹا سا قد پایا تھا۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی۔ سر پر انگریزی تراش کے بال۔ قمیص۔ تنگ موہری کا پاجامہ اور شیروانی زیب تن کرتے تھے۔ سر پر یہی عام مصنوعی کھال کی ٹوپی۔ مگر نہایت باوضع۔ صاف ستھرے۔ نفیس ذوق کے آدمی تھے۔ کھانے۔ پہننے۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ چلنے پھرنے میں ان کی نفاستِ مذاق لوگوں کی توجہ کو بطورِ خاص جذب کرتی تھی۔

دوست احباب کو جمع کر کے دھما چوکڑی مچانے کے بہت شوقین تھے۔ مثلاً دو تین دفعہ گرمی کے موسم میں تین بجے بعد دوپہر "تربوز پارٹی"، دی۔ ایں۔ امتیاز بخاری اور ایک اور دوست لاہور کی قیامت خیز دھوپ میں چنگڑ محلّے (انارکلی) کے اس بالاخانے میں پہنچے جو بیدل صاحب کا گھونسلا تھا۔ دیکھا۔ کہ کمرے میں پردے ڈال کر اندھیرا کر رکھا ہے۔ فرش پر چاندنی بچھی ہے۔ دسترخوان پر بیر بڑے

بڑے تربوز سینیوں میں لگے ہیں۔ برف کی کوئی کمی نہیں اور ہر تربوز کے پاس دو دو چھریاں رکھی ہیں۔ ہم بیٹھتے ہی تربوزوں پر پل پڑے۔ لطیفوں اور چٹکلوں اور قہقہوں میں خدا جانے کتنے تربوز کاٹ کاٹ کر کھا گئے۔ اور اس کے بعد فرش پر لوٹ مارنے لگے جو ہر کھانے کے بعد ہمارا بہترین قیلولہ تسلیم کیا گیا تھا۔ اب بھی جب اعجاز بخاری مَیں اور احمد سلمان جمع ہو جائیں تو ہم لوگ کھانا کھانے کے بعد چین سے صوفوں پر بیٹھنا بد ذوقی سمجھتے ہیں۔ بلکہ صوفوں کو ہٹا کر تکیے رکھ دیتے جاتے ہیں اور فرش پر دراز ہو کر "لوٹ مار قیلولہ" کیا جاتا ہے۔

اگر ہم کبھی فیصلہ کرتے کہ مولانا۔ چلو۔ کالا شاہ کاکو جا کر ڈیک پر مچھلی پکڑیں تو مولانا جھٹ تیار ہو جاتے۔ بلکہ خود ہی منشی نعمت اللہ (مالک دہلی مسلم ہوٹل) کو چھڑوں ڈوریوں کیچوؤں اور دوسری متعلقات کے سلسلے میں مشورے دینے لگتے۔ جب ہم دوسرے دن علی الصباح ٹیکسی میں سوار ہو کر کالا شاہ کاکو کی طرف روانہ ہوتے تو سب سے زیادہ شور مولانا بیدل مچاتے۔ اور ہزل گوئی اور ہرزہ سرائی میں بھی ہم سب پر بازی لے جاتے۔ مچھلی کم پکڑتے اور خرافات زیادہ بکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مچھلی پکڑنے کے مشغلے سے مقصود کچھ اور تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہفتے بھر کے متین و سنجیدہ مشاغل سے دماغوں میں جو پھپھوندی سی لگ جاتی تھی۔ وہ اتر جائے۔ اور آئندہ ہفتے کو زندگی کی نئی حرارت سے شروع کیا جائے۔ بہرحال بیدل صاحب ہمارے تمام مشاغل میں ہم سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ عمر کے اعتبار سے ہمارے بزرگ ہیں۔ گو ہماری طرف سے ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رہتا یہ فی الحقیقت نہایت دردناک امر ہے کہ ایسا ذی علم اور خوش ذوق آدمی اپنے

کوئی علمی وادبی آثار چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بیدل کبھی کبھی مزے میں آ کر اپنی پرانی غزلوں کے بعض اشعار سنایا کرتے۔ جن میں سے چار پانچ مجھے یاد ہیں۔ ان سے ان کے ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

یوں دن مرے شباب کا چڑھتے ہی ڈھل گیا
جھونکا تھا اک ہوا کا کہ سن سے نکل گیا
یاد آ گئی جو نشّے میں ساقی کی چشم مست
میں گرتے گرتے ساغرِ مے پر سنبھل گیا

دونوں جل بجھتے ہیں یہ فیصلہ اب تک نہ ہوا
شمع میں سوز زیادہ ہے کہ پروانے میں
ٹپکی پڑتی ہے تری آنکھ سے مستی ساقی
اتنی مے ہے کہ سماتی نہیں پیمانے میں

میرے ہو یا رقیب کے، دم بھر کے یار ہو
جس کی بھی زندگی ہو، غرض مستعار ہو
لپٹا رہا ہوں سینے سے دل کو شبِ فراق
مطلب یہ ہے بغل میں کوئی بے قرار ہو

کچھ مدّت کے بعد مولانا بیدل لاہور سے چلے گئے اور پھر بدستور ملک کے مختلف شہروں کے چکر کاٹنے لگے۔ ایک دفعہ لاہور میں خدّام الحرمین کی ایک کانفرنس ہوئی۔

جس میں بڑے بڑے علماء اور سجادہ نشین شامل ہوتے۔ حضرت سجادہ نشین صاحب کچھوچھہ شریف سے چونکہ مولانا بیدل کے کچھ خاندانی اور کچھ ذاتی تعلقات تھے۔ اس لئے وہ بیدل صاحب کو بھی اپنے ساتھ لاہور لے آئے اور ہم نے مُدّتِ دراز کے بعد اپنے اس محبوب دوست کے دیدار سے آنکھیں روشن کیں۔ امتیاز کے ہاں طعامِ شب کی دعوت ہوئی۔ تین چار گھنٹے بہت لطف سے کٹے۔ بیدل اس وقت بہت کمزور ہو رہے تھے۔ معلوم ہوا دو مہینے طبیعت ناساز رہی ہے۔ دوسرے دن وہ سجادہ نشین صاحب کے ساتھ ہی واپس چلے گئے اور وعدہ کر گئے کہ پھر لاہور آئیں گے۔ لیکن چند ماہ کے بعد یہ خبر آئی کہ بھوپال میں ایک دوست کے مکان پر سید حامد حسین بیدل شاہجہان پوری کا انتقال ہوگیا۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

کتاب خانہ مسعود جھنڈیر
میلسی (پاکستان)
نمبر شمار .....
....
کتاب نمبر.........
....

کتابت، محمد یونس دفترِ کتابت ۸۸، میکلوڈ روڈ لاہور، ۲۵؍ اپریل ۶۷ء

Masood Faisal Jhandir Library

تصویریں نہیں تحریریں

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ایک لحظہ کے لئے آپ سوچیں، کہ آپ اخبار کیوں پڑھتے ہیں؟

تصویروں کے لئے ——

تو مُعاف کیجئے "چٹان" یہ بُت کدہ سجا نہیں سکتا ——

بازاری ادب کیلئے ——

"چٹان" اس مُعاملہ میں اپنی تہی دامنی کا اعتراف کرتا ہے۔

"چٹان" کا نصب العین ہے

- ذہنی نشوونما • کلمۃ الحق کی اشاعت • اکابر کے سوانح
- معاشرتی احتساب • تہذیبی تجزیہ • سیاسی جائزے

ایڈیٹر —— شورش کاشمیری

سالانہ قیمت پندرہ روپے
ششماہی " آٹھ روپے
فی پرچہ " ۳۷ پیسے

آپ کی رفاقت کا متمنی
جنرل مینیجر
ہفتہ وار "چٹان" ۸۴ میکلوڈ روڈ، لاہور